اَن داتا

کرشن چندر

نیا ادارہ • لاہور

آن داتا

اَن داتا

کرشن چندر

نیا ادارہ • لاہور

دوسری بار
قیمت دو روپے آٹھ آنے
پبلشر ـ نذیر چودھری۔ نیا ادارہ، لاہور
پرنٹر۔ کواپریٹو کیپٹل پرنٹنگ پریس، لاہور

ترتیب

ان داتا، ۹

ممو بی، ۷۳

بھگت رام، ۱۲۱

شمع کے سامنے، ۱۴۹

"اَن داتا" کے نام

خطیب
ادیب
شاعر

ان داتا

"تری دُنیا میں مَیں محکوم و مجبور"

(بال جبریل)

بابِ اوّل:۔ وُہ آدمی جس کے ضمیر میں کانٹا ہے!

بابِ دوم:۔ وُہ آدمی جو مر چکا ہے!

بابِ سوم:۔ وُہ آدمی جو ابھی زندہ ہے!

وہ آدمی جس کے ضمیر میں کانٹا ہے!

(ایک غیر ملکی قونصل کے مکتوبات جو اُس نے اپنے افسرِ اعلیٰ کو کلکتے سے روانہ کئے)

۸ر اگست ۱۹۴۳ء کلایو سٹریٹ، مون شائن وِلا

جنابِ والا

کلکتہ، ہندوستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔ ہوڑہ پل ہندوستان کا سب سے عجیب و غریب پُل ہے۔ بنگالی قوم ہندوستان کی سب سے ذہین قوم ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی ہندوستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے، کلکتے کا "سوناگاچی" ہندوستان میں طوائفوں کا سب سے بڑا بازار ہے۔ کلکتے کا سندربن چیتوں کی سب سے بڑی شکارگاہ

ہے۔ کلکتہ جُوٹ کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ کلکتے کی سب سے بڑھیا مٹھائی کا نام "رشوگلا" ہے۔ کہتے ہیں اسے ایک طوائف نے ایجاد کیا تھا لیکن شومیٔ قسمت سے وُہ اسے پیٹنٹ نہ کرا سکی۔ کیونکہ ان دنوں ہندوستان میں کوئی ایسا قانون موجود نہ تھا۔ اسی لئے وُہ طوائف اپنی زندگی کے آخری ایام میں بھیک مانگتے مری۔ ایک الگ پارسل میں حضورِ پُر نور کی ضیافتِ طبع کے لئے دو سو "رشوگلے" بھیج رہا ہوں۔ اگر انہیں قیمے کے ساتھ کھایا جائے تو بہت مزا دیتے ہیں میں نے خود بتجربہ کیا ہے۔

مَیں ہوں جناب کا ادنےٰ ترین خادم

ایف۔ بی۔ پٹاخا

قونصل مملکتِ سانڈوگھاس برائے کلکتہ

۹ راگست، کلایو سٹریٹ

جنابِ والا

حضورِ پُرنور کی منجھلی بیٹی نے مجھ سے سپیرے کی بانسی کی فرمائش کی تھی۔ آج شام بازار میں مجھے ایک سپیرا مل گیا۔ پچیس ڈالر دے کر میں نے اک

خوبصورت بانبی خریدلی ہے۔ یہ بانبی اسفنج کی طرح ہلکی اور سُبک اندام ہے۔ یہ ایک ہندوستانی پھل سے جسے "لوکی" کہتے ہیں، تیار کی جاتی ہے۔ یہ بانبی بالکل ہاتھ کی بنی ہوئی ہے اور اسے تیار کرتے وقت کسی مشین سے کام نہیں لیا گیا۔ میں نے اس بانبی پر پالش کرایا ہے اور اسے ساگوان کے ایک خوشنما بکس میں بند کرکے حضور پُرنور کی منجھلی بیٹی ایڈتھ کے لئے بطور تحفہ ارسال کر رہا ہوں۔

میں ہوں جناب کا خادم

ایف، بی، پٹاخہ

۱۰ راگست

کلکتے میں ہمارے ملک کی طرح راشننگ نہیں ہے۔ غذا کے معاملے میں ہر شخص کو مکمل شخصی آزادی ہے۔ وہ بازار سے جتنا اناج چاہے خرید لے۔ کل مملکتِ ٹلی کے قونصل نے مجھے کھانے پر مدعو کیا۔ چھبیس قسم کے گوشت کے سالن تھے۔ سبزیوں اور میٹھی چیزوں کے دو درجن کورس تیار کئے گئے تھے۔ (نہایت عمدہ شراب تھی) ہمارے ہاں جیسا کہ حضور اچھی طرح جانتے ہیں پیاز تک کی راشننگ ہے۔ اس لحاظ سے کلکتے کے باشندے بڑے خوش قسمت ہیں

کھانے پر ایک ہندوستانی انجینئر بھی مدعو تھا۔ یہ انجینئر ہمارے ملک کا تعلیمیافتہ ہے۔ باتوں باتوں میں اس نے ذکر کیا کہ کلکتے میں قحط پڑا ہوا ہے۔ اس پر اٹلی کا قونصل قہقہہ مار کر ہنسنے لگا اور مجھے بھی اس ہنسی میں شریک ہونا پڑا۔ دراصل یہ پڑھے لکھے ہندوستانی بھی بڑے جاہل ہوتے ہیں۔ کتابی علم سے قطع نظر انہیں اپنے ملک کی صحیح حالت کا کوئی اندازہ نہیں۔ ہندوستان کی دو تہائی آبادی دن رات غلّہ اور بچے پیدا کرنے میں مصروف رہتی ہے۔ اس لئے یہاں پر غلّے اور بچوں کی کمی کبھی نہیں ہونے پاتی۔ بلکہ جنگ سے پیشتر تو بہت سا غلّہ دساور کو جاتا تھا اور بچے قلی بنا کر جنوبی افریقہ بھیج دیئے جاتے ہیں۔ اب ایک عرصے سے قلیوں کو باہر بھیجنا بند کر دیا گیا ہے۔ اور ہندوستانی صوبوں کو "ہوم رول" دے دیا گیا ہے۔ مجھے یہ ہندوستانی انجینئر تو کوئی ایجی ٹیٹر قسم کا خطرناک آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے چلے جانے کے بعد میں نے موسیو ژاں ژاں تریپ ٹلی کے قونصل سے اس کا تذکرہ چھیڑا۔ تو موسیو ژاں ژاں تریپ نے بڑے غور وخوض کے بعد یہ رائے دی کہ ہندوستان اپنے ملک پر حکومت کی قطعاً اہلیت نہیں رکھتا۔ چونکہ موسیو ژاں ژاں تریپ کی حکومت کو بین الاقوامی معاملات میں ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ اس لئے

ہیں اُن کی راسئے دبتغمع سمجھتا ہوں۔

میں ہوں جناب کا خادم

ایف، بی، پی

۱۱ ر اگست

آج صبح بولپور سے واپس آیا ہوں۔ وہاں ڈاکٹر ٹیگور کا "شانتی نیکیتان" دیکھا۔ کہنے کو تو یہ ایک یونیورسٹی ہے۔ لیکن پڑھائی کا یہ عالم ہے کہ طالب علموں کے بیٹھنے کیلئے ایک بنچ بھی نہیں۔ اُستاد اور طالب علم سبھی درختوں کے نیچے آلتی پالتی مارے بیٹھے رہتے ہیں اور خدا جانے کچھ پڑھتے بھی ہیں یا یوں ہی اونگھتے ہیں۔ میں وہاں سے بہت جلد چلا آیا۔ کیونکہ دھوپ بہت تیز تھی اور اُوپر درختوں کی شاخوں میں چڑیاں شور مچا رہی تھیں۔

ف۔ ب۔ پ

۱۲ ر اگست

آج چینی قونصل کے ہاں لنچ پر پھر کسی نے کہا کہ کلکتے میں سخت قحط پڑا

ہوا ہے۔ لیکن وثوق سے کوئی کچھ نہ کہہ سکا کہ اصل ماجرا کیا ہے ہم سب لوگ حکومتِ بنگال کے اعلان کا انتظار کر رہے ہیں۔ اعلان کے جاری ہوتے ہی حضور کو مزید کوائف سے مطلع کر دوں گا۔ بیگ میں حضور پُر نور کی منجھلی بیٹی ایڈتھ کے لئے ایک جوتی بھی ارسال کر رہا ہوں۔ یہ جوتی سبز رنگ کے سانپ کی جلد سے بنائی گئی ہے۔ سبز رنگ کے سانپ برما میں بہت ہوتے ہیں۔ اُمید ہے کہ جب برما دوبارہ حکومتِ انگلشیہ کی عملداری میں آ جائے گا تو ان جوتیوں کی تجارت کو بہت فروغ حاصل ہو سکے گا۔

میں ہوں جناب کا وغیرہ وغیرہ

الیف۔ بی۔ پی

۱۳ر اگست

آج ہمارے سفارت خانے کے باہر دو عورتوں کی لاشیں پائی گئی ہیں ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتی تھیں۔ شاید "سوکھیا" کی بیماری میں مبتلا تھیں۔ ادھر بنگال میں اور غالباً سارے ہندوستان میں "سوکھیا" کی بیماری پھیلی ہوئی ہے اس عارضے میں انسان گھلتا جاتا ہے اور آخر میں سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ

ہو کر مر جاتا ہے۔ یہ بڑی خوفناک بیماری ہے۔ لیکن ابھی تک اس کا کوئی شافی علاج دریافت نہیں ہوا۔ کونین کثرت سے مفت تقسیم کی جا رہی ہے لیکن کونین میگنیشیا یا کسی اور مغربی دوا سے اس عارضے کی شدت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دراصل ایشیائی بیماریوں کی نوعیت مغربی امراض سے مختلف ہے۔ بہت مختلف ہے۔ یہ اختلاف اس مفروضے کا بدیہی ثبوت ہے کہ ایشیائی اور مغربی دو مختلف انسان ہیں۔

حضور پُر نور کی رفیقۂ حیات کے باسٹھویں جنم دن کی خوشی میں بدھ کا ایک مرمر کا بُت ارسال کر رہا ہوں۔ اسے میں نے پانسو ڈالر میں خریدا ہے۔ یہ مہاراجہ بندھو سار کے زمانے کا ہے اور مقامی راہب خانے کی زینت تھا۔ حضور پُر نور کی رفیقۂ حیات کے ملاقاتیوں کے کمرے میں خوب سجے گا۔

مکرر عرض ہے کہ سفارت خانے کے باہر پڑی ہوئی لاشوں میں ایک بچہ بھی تھا جو اپنی مردہ ماں کے تھنوں سے دودھ چوسنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے ہسپتال بھجوا دیا ہے۔

حضور پُر نور کا غلام

الیف۔ بی۔ پی

۱۴ر اگست

ڈاکٹر نے بچے کو ہسپتال میں داخل کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ بچہ ابھی سفارت خانے میں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا کروں حضور پُر نور کی ہدایات کا انتظار ہے۔ ٹرلی کے قونصل نے مشورہ دیا ہے کہ اس بچے کو جہاں سے پایا تھا۔ وہیں چھوڑ دوں لیکن میں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ اپنی حکومت کے صدر سے مشورہ کئے بغیر کوئی ایسا اقدام کروں۔ جس کے سیاسی نتائج نہ جانے کتنے مہلک ہوں۔

ایف۔ بی۔ پی

۱۶ر اگست

آج سفارت خانے کے باہر پھر لاشیں پائی گئیں۔ یہ سب لوگ اسی بیماری کا شکار معلوم ہوتے تھے۔ جس کا میں اپنے گذشتہ مکتوبات میں ذکر کر چکا ہوں۔ میں نے بچے کو انہی لاشوں میں چپکے سے رکھ دیا ہے۔ اور پولیس کو ٹیلیفون کر دیا ہے کہ وہ انہیں سفارت خانے کی سیڑھیوں سے اٹھانے کا بندوبست کرے۔ امید ہے آج شام تک سب لاشیں اٹھ جائیں گی۔ ایف۔ بی۔ پی

۱۷ر اگست

کلکتے کے انگریزی اخبار "سٹیٹسمین" نے اپنے افتتاحیہ میں آج اس امر کا اعلان کیا ہے کہ کلکتے میں سخت قحط پھیلا ہوا ہے۔ یہ اخبار چند روز سے قحط زدگان کی تصاویر بھی شائع کر رہا ہے۔ ابھی تک وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ فوٹو اصلی ہیں یا نقلی۔ بظاہر یہ فوٹو سوکھیا بیماری کے مریضوں کے معلوم ہوتے ہیں لیکن تمام غیر ملکی قونصل اپنی رائے "محفوظ" رکھ رہے ہیں۔

۲۰ر اگست

سوکھیا بیماری کے مریضوں کو اب ہسپتال میں داخل کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ صرف کلکتے ہی میں دو ڈھائی سو آدمی اس بیماری کا شکار ہو جاتے ہیں اور اب یہ بیماری ایک وبا کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ ڈاکٹر لوگ بہت پریشان ہیں۔ کیونکہ کونین کھلانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا مرض میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوتی۔ ہاضمے کا مکسچر میگنیشیا مکسچر، اور ٹنکچر آیوڈین یعنی پورا برٹش فارماکوپیا بے کار ہے۔ چند مریضوں کا خون لے کر مغربی سائنسدانوں کے پاس بغرض تحقیقات بھیجا جا رہا ہے اور عین ممکن ہے

کہ کسی غیر معمولی مغربی اکسپرٹ کی خدمات بھی حاصل کی جائیں۔ یا ایک رائیل کمیشن بٹھا دیا جائے جو چار پانچ سال میں اچھی طرح چھان بین کر کے اس امر کے متعلق اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کرے۔ الغرض ان غریب مریضوں کو بچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ آگے جیسا بائیبل میں لکھا ہے۔ اللہ مالک ہے۔ گو بنگالی اخباروں میں بڑی شد و مد کے ساتھ اعلان کیا گیا ہے کہ سارے بنگال میں قحط کا دور دورہ ہے۔ اور ہزاروں آدمی ہر ہفتے غذا کی کمی کی وجہ سے مر جاتے ہیں لیکن ہماری نوکرانی (جو خود بنگالن ہے) کا خیال ہے کہ یہ اخبارچی جھوٹ بولتے ہیں۔ جب وہ بازار میں چیزیں خریدنے جاتی ہے تو اسے ہر چیز مل جاتی ہے۔ دام بے شک بڑھ گئے ہیں لیکن یہ مہنگائی تو جنگ کی وجہ سے ناگزیر ہے

۲۵ ر اگست

آج سیاسی حلقوں نے قحط کی تردید کر دی ہے۔ بنگال اسمبلی نے جس میں ہندوستانی ممبروں اور وزراء کی کثرت ہے۔ آج اعلان کر دیا ہے کہ کلکتہ اور بنگال کا علاقہ "قحط زدہ علاقہ" قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے

کہ بنگال میں فی الحال راشننگ نہ ہوگا۔ یہ خبر سن کر غیر ملکی قونصلوں کے دل میں اطمینان کی اک لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ اگر بنگال قحط زدہ علاقہ قرار دیا جاتا تو راشننگ کا فی الفور نفاذ ہوتا اور ۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ اگر راشننگ کا نفاذ ہوتا تو اس کا اثر ہم لوگوں پر بھی پڑتا۔ موسیو سی گل جو فرنچ قونصل ہیں۔ کل ہی مجھ سے کہہ رہے تھے کہ عین ممکن ہے راشننگ ہو جائے، اس لئے تم ابھی سے شراب کا بندوبست کر لو۔ میں چندر نگر سے فرانسیسی شراب منگوانے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ سنا ہے کہ چندر نگر میں کئی سو سال کی پرانی شراب بھی دستیاب ہوتی ہے بلکہ اکثر شرابیں تو انقلابِ فرانس سے بھی پہلے کی ہیں۔ اگر حضور پُر نور مطلع فرمائیں تو چند بوتلیں چکھنے کے لئے بھیج دوں۔

ف۔ ب۔ پ

۲۸ راگست

کل ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں نے نیو مارکیٹ سے اپنی سب سے چھوٹی بہن کے لئے چند کھلونے خریدے۔ ان میں ایک چینی کی گڑیا بہت ہی حسین تھی اور ماریا کو بے حد پسند تھی۔ میں نے ڈیڑھ ڈالر دے کر وہ گڑیا بھی خرید لی اور ماریا کو انگلی سے لگائے باہر آ گیا۔ کار میں بیٹھنے کو تھا کہ اک

ادھیڑ عمر کی بنگالی عورت نے میرا کوٹ پکڑ کر مجھے بنگالی زبان میں کچھ کہا میں نے اس سے اپنا دامن چھڑا لیا اور کار میں بیٹھ کر اپنے بنگالی شوفر سے پوچھا "یہ کیا چاہتی ہے؟"

ڈرائیور بنگالی عورت سے بات کرنے لگا۔ اس عورت نے جواب دیتے ہوئے اپنی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ جسے وہ اپنے شانے سے لگائے کھڑی تھی۔ بڑی بڑی موٹی آنکھوں والی زرد رُو بچی بالکل چینی کی گڑیا معلوم ہوتی تھی اور ماریا کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔

پھر بنگالی عورت نے تیزی سے کچھ کہا۔ بنگالی ڈرائیور نے اسی سرعت سے جواب دیا۔

"کیا کہتی ہے یہ" میں نے پوچھا۔

ڈرائیور نے اس عورت کی ہتھیلی پہ چند سکّے رکھے اور کار آگے بڑھائی۔ کار چلاتے چلاتے بولا۔ "حضور یہ اپنی بچی بیچنا چاہتی تھی۔ ڈیڑھ روپے میں"

ڈیڑھ روپے میں، یعنی نصف ڈالر میں؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا "ارے نصف ڈالر میں تو چینی کی گڑیا بھی نہیں آتی؟"

"آج کل نصف ڈالر میں بلکہ اس سے بھی کم قیمت پر ایک بنگالی بچی مل

سکتی ہے صاحب!"

میں حیرت سے اپنے ڈرائیور کو تکتا رہ گیا۔

اس وقت مجھے اپنے وطن کی تاریخ کا وہ باب یاد آیا۔ جب ہمارے آباو اجداد افریقہ سے حبشیوں کو زبردستی جہاز میں لاد کر اپنے ملک میں لے آتے تھے اور منڈیوں میں غلاموں کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ ان دنوں ایک معمولی سے معمولی حبشی بھی پچیس تیس ڈالر سے کم میں نہ بکتا تھا۔ افوہ، کس قدر غلطی ہوئی۔ ہمارے بزرگ اگر افریقہ کے بجائے ہندوستان کا رخ کرتے تو بہت سستے داموں غلام حاصل کر سکتے تھے۔ حبشیوں کے بجائے اگر وہ ہندوستانیوں کی تجارت کرتے تو لاکھوں ڈالر کی بچت ہو جاتی۔ ایک ہندوستانی لڑکی نصف ڈالر میں! اور ہندوستان کی کل آبادی چالیس کروڑ ہے۔ گویا بیس کروڑ ڈالر میں ہم پورے ہندوستان کی آبادی کو خرید سکتے تھے۔ ذرا خیال تو فرمائیے کہ بیس کروڑ ڈالر ہوتے ہی کتنے ہیں۔ اس سے زیادہ رقم تو ہمارے وطن میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ اگر حضور پُرنور کی منجھلی بیٹی کو یہ پسند ہو تو میں ایک درجن بنگالی لڑکیاں بذریعہ ہوائی جہاز پارسل کر دوں! اب مجھے شوفر نے بتایا ہے کہ آج کل "سوناگاچی" جہاں کلکتے کی طوائفیں رہتی ہیں، اس قسم

کی بردہ فروشی کا اڈہ ہے۔ سینکڑوں کی تعداد میں لڑکیاں شب و روز فروخت کی جا رہی ہیں۔ لڑکیوں کے والدین فروخت کرتے ہیں اور رنڈیاں خریدتی ہیں عام نرخ سوا روپیہ ہے۔ لیکن اگر بچی قبول صورت ہو تو چار پانچ بلکہ دس روپے بھی مل جاتے ہیں۔ چاول آج کل بازار میں ساٹھ ستر روپے فی من ملتا ہے۔ اس حساب سے اگر ایک کنبہ اپنی دو بچیاں بھی فروخت کر دے تو کم از کم آٹھ دس دن اور زندگی کا دھندا کیا جا سکتا ہے۔ اور اوسطاً بنگالی کنبے میں لڑکیوں کی تعداد دو سے زیادہ ہوتی ہے۔

کل میئر آف کلکتہ نے شام کے کھانے پر مدعو کیا ہے۔ وہاں یقیناً بہت دلچسپ باتیں سننے میں آئیں گی۔

ن - ب - پ

۲۹ راگست۔

میئر آف کلکتہ کا خیال ہے کہ بنگال میں شدید قحط ہے اور حالت بیحد خطرناک ہے۔ اس نے مجھ سے اپیل کی کہ میں اپنی حکومت کو بنگال کی مدد کیلئے

آمادہ کرواں۔ میں نے اسے اپنی حکومت کی ہمدردی کا یقین دلایا۔ لیکن یہ امر بھی اس پر واضح کر دیا۔ کہ یہ قحط ہندوستان کا اندرونی مسئلہ ہے اور ہماری حکومت کسی دوسری قوم کے معاملات میں دخل دینا نہیں چاہتی۔ ہم سچے جمہوریت پسند ہیں اور کوئی سچا جمہوریہ آپ کی آزادی سلب کرنا نہیں چاہتا ہر ہندوستانی کو جینے یا مرنے کا اختیار ہے۔ یہ ایک شخصی یا زیادہ سے زیادہ ایک قومی مسئلہ ہے اور اس کی نوعیت بین الاقوامی نہیں۔ اس موقعہ پر موسیو ژاں ژاں ژیپ بھی بحث میں شامل ہو گئے اور کہنے لگے۔ جب آپ کی اسمبلی نے بنگال کو قحط زدہ علاقہ (Famine Area) ہی نہیں قرار دیا تو اس صورت میں آپ دوسری حکومتوں سے مدد کیونکر طلب کر سکتے ہیں۔ اس پر پریمئر آف کلکتہ خاموش ہو گئے اور رس گلے کھانے لگے۔

ف۔ ب۔ پ

۳۰ راگست

مسٹر ایمری نے جو برطانوی وزیرِ ہند ہیں۔ ہاؤس آف کامنز میں ایک بیان دیتے ہوئے فرمایا کہ "ہندوستان میں آبادی کا تناسب غذائی اعتبار سے

حوصلہ شکن ہے "ہندوستان کی آبادی میں ڈیڑھ سوگنا اضافہ ہوا ہے۔ درحالیکہ زمینی پیداوار بہت کم بڑھی ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ ہندوستانی بہت کھاتے ہیں۔"

یہ تو حضور میں نے بھی آزمایا ہے کہ ہندوستانی لوگ دن میں دو بار بلکہ اکثر حالتوں میں صرف ایک بار کھانا کھاتے ہیں لیکن اس قدر کھاتے ہیں کہ ہم مغربی لوگ دن میں پانچ بار بھی اس قدر نہیں کھا سکتے۔ موسیو ژاں ژریپ کا خیال ہے کہ بنگال میں شرح اموات کے بڑھنے کی سب سے بڑی وجہ یہاں کے لوگوں کا پیٹو پن ہے۔ یہ لوگ اتنا کھاتے ہیں کہ اکثر حالتوں میں پیٹ پھٹ جاتا ہے۔ اور وہ جہنم واصل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مثل مشہور ہے کہ ہندوستانی کبھی منہ پھٹ نہیں ہوتا لیکن پیٹ پھٹ ضرور ہوتا ہے۔ لیکن حضور میں نے تو جتنے ہندوستانی دیکھے سب کو منہ پھٹ۔ پیٹ پھٹ، بلکہ اکثر حالتوں میں تلی پھٹ بھی پایا۔ نیز یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ہندوستانیوں اور چوہوں کی شرح پیدائش دنیا میں سب سے زیادہ ہے اور اکثر حالتوں میں ان دونوں میں امتیاز کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ جتنی جلدی پیدا ہوتے ہیں۔ اتنی جلدی مر جاتے ہیں۔ اگر چوہوں کو پلیگ ہوتی ہے تو ہندوستانیوں کو "سوکھیا" بلکہ عموماً پلیگ اور سوکھیا دونوں لاحق ہو جاتی ہیں۔ بہر حال جب تک چوہے اپنے بل

ہیں رہیں اور دنیا کو پریشان نہ کریں۔ ہمیں ان کے نجی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔

غذائی محکمے کے ممبر حالات کی جانچ پڑتال کے لیے تشریف لائے ہیں۔ بنگالی حلقوں میں یہ امید ظاہر کی جا رہی ہے کہ آنریبل ممبر پر اب یہ واضح ہو جائے گا کہ بنگال میں واقعی قحط ہے اور شرح اموات کے بڑھنے کا سبب بنگالیوں کی انارکسٹانہ حرکات نہیں بلکہ غذائی بحران ہے۔

ف۔ ب۔ پ

۲۰ ستمبر

آنریبل ممبر تحقیقات کے بعد واپس دہلی چلے گئے ہیں۔ سنا ہے وہاں حضور وائسرائے بہادر سے ملاقات کریں گے اور اپنی تجاویز ان کے سامنے رکھیں گے

۲۵ ستمبر

لندن کے انگریزی اخباروں کی اطلاع کے مطابق ہر روز کلکتے کی گلیوں، سڑکوں اور فٹ پاتھ پر لوگ مر جاتے ہیں بہر حال یہ سب اخباری اطلاعیں ہیں۔ سرکاری طور پر

اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ بنگال میں قحط ہے۔ سب لوگ پریشان ہیں۔ چینی قونصل کل مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ بنگال کے فاقہ کشوں کے لئے ایک امدادی فنڈ کھولنا چاہتا ہے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ کوئی کہتا ہے کہ قحط ہے۔ کوئی کہتا ہے قحط نہیں ہے۔ میں نے اسے سمجھایا۔ بیوقوف نہ بنو۔ اس وقت تک ہمارے پاس مصدقہ اطلاع یہی ہے کہ غذائی بحران اس لئے ہے کہ ہندوستانی بہت زیادہ کھاتے ہیں۔ اب تم ان لوگوں کے لئے ایک امدادی فنڈ کھول کر گویا ان کے پیٹوپن کو اور شہ دو گے۔ یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ لیکن چینی قونصل میری تشریحات سے غیر مطمئن معلوم ہوتا تھا۔

۲۸۔ ستمبر

دلّی میں غذائی مسئلے پر غور کرنے کے لئے ایک کانفرنس بلائی جا رہی ہے، آج پھر یہاں کئی سو لوگ "سوکھیا" سے مر گئے۔ یہ بھی خبر آئی ہے کہ مختلف صوبائی حکومتوں نے رعایا میں اناج تقسیم کرنے کی جو سکیم بنائی تھی۔ اس سے انہوں نے کئی لاکھ روپے کا منافع حاصل کیا ہے۔ اس میں بنگال کی حکومت بھی شامل ہے۔

ف۔ ب۔ پ

۲۰ر اکتوبر

کل گرانڈ ہوٹل میں "یومِ بنگال" منایا گیا۔ کلکتے کے یورپین امرا و شرفا کے علاوہ حکام اعلیٰ، شہر کے بڑے سیٹھ اور مہاراجے بھی اس دلچسپ تفریح میں شریک تھے ڈانس کا انتظام خاص طور پر اچھا تھا۔ میں نے مسز جیولٹ تریپ کے ساتھ دو مرتبہ ڈانس کیا (مسز تریپ کے منہ سے لہسن کی بو آتی تھی۔ نہ جانے کیوں؟) مسز تریپ سے یہ معلوم ہوا کہ اس جشنِ ماہتابی کے موقعہ پر یومِ بنگال کے سلسلے میں نو لاکھ روپیہ اکٹھا ہوا ہے۔ مسز تریپ بار بار چاند کی خوبصورتی اور رات کی سیاہ ملائمت کا ذکر کر رہی تھیں اور ان کے منہ سے لہسن کے بھپارے اٹھ رہے تھے۔ جب مجھے ان کے ساتھ دوبارہ ڈانس کرنا پڑا تو میرا جی چاہتا تھا کہ ان کے منہ پر لائی سول یا فینائل چھڑک کر ڈانس کروں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ مسز جیولٹ تریپ موسیو ژاں ژاں تریپ کی باوقار بیوی ہیں اور موسیو ژاں ژاں تریپ کی حکومت کو بین الاقوامی معاملات میں ایک قابلِ رشک مرتبہ حاصل ہے!

ہندوستانی خواتین میں مس سنہا سے تعارف ہوا۔ بڑی قبول صورت ہے اور بے حد اچھا ناچتی ہے!

ف - ب - پ

۲۶ر اکتوبر

مسٹر منشی حکومت بمبئی کے ایک سابق وزیر کا اندازہ ہے کہ بنگال میں ہر ہفتے قریباً ایک لاکھ افراد قحط کا شکار ہو رہے ہیں لیکن یہ سرکاری اطلاع نہیں ہے۔ قونصل خانے کے باہر آج پھر چند لاشیں پائی گئیں۔ شوفر نے بتایا کہ یہ ایک پورا خاندان تھا جو دیہات سے روٹی کی تلاش میں کلکتہ آیا تھا۔ پرسوں بھی اسی طرح میں نے ایک مغنی کی لاش دیکھی تھی۔ ایک ہات میں وہ اپنی ستار پکڑے ہوئے تھا اور دوسرے ہات میں لکڑی کا ایک جھنجھنا۔ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کا کیا مطلب تھا..... بیچارے چوہے کس طرح چپ چاپ مر جاتے ہیں اور زبان سے اف تک بھی نہیں کرتے ہیں نے ہندوستانیوں سے زیادہ شریف چوہے دنیا میں اور کہیں نہیں دیکھے۔ اگر امن پسندی کے لئے نوبل پیس پرائز کسی قوم کو مل سکتا ہے تو وہ ہندوستانی ہیں یعنی لاکھوں کی تعداد میں بھوکے مر جاتے ہیں لیکن زبان پر اک کلمہ شکایت نہیں لائیں گے صرف بے روح، بے نور آنکھوں سے آسمان کی طرف تاکتے ہیں۔ گویا کہہ رہے ہوں۔ ان داتا! ان داتا! کل رات بھر مجھے اس مغنی کی خاموش شکایت سے معمور جامد و ساکت، پتھریلی بے نور نگاہیں پریشان کرتی رہیں۔

۵ر نومبر

نئے حضور وائسرائے بہادر تشریف لائے ہیں۔ سنا ہے کہ انہوں نے فوج کو قحط زدہ لوگوں کی امداد پر مامور کیا ہے اور جو لوگ کلکتے کے گلی کوچوں میں مرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ان کے لئے باہر مضافات میں مرکز کھول دیئے گئے ہیں۔ جہاں ان کی آسائش کے لئے سب سامان بہم پہنچایا جائے گا۔

۱۰ر نومبر

موسیو ژاں ترپ کا خیال ہے کہ یہ عین ممکن ہے کہ بنگال میں واقعی قحط ہو اور سوکھیا کی بیماری کی اطلاعیں غلط ہوں۔ غیر ملکی قونصل خانوں میں اس ریمارک سے ہلچل مچ گئی ہے۔ مملکتِ گوریا، لوبیا اور ڈسٹر سلوو کیا کے قونصلوں کا خیال ہے کہ موسیو ژاں ترپ کا یہ جملہ کسی آنے والی خوفناک جنگ کا پیش خیمہ ہے۔ یورپی اور ایشیائی ملکوں سے بھاگے ہوئے لوگوں میں جو آج کل ہندوستان میں مقیم ہیں وائسرائے کی اس سکیم کے متعلق مختلف شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ وہ لوگ سوچ رہے ہیں اگر بنگال واقعی قحط زدہ علاقہ قرار دیدیا گیا تو ان کے الاؤنس کا کیا بنے گا؟ وہ لوگ کہاں جائیں گے؟ میں حضور پُر نور کی توجہ اس سیاسی

الجھن کی طرف دلانا چاہتا ہوں جو وائسرائے بہادر کے اعلان سے پیدا ہوگئی ہے (Refugees) کے حقوق کی حفاظت کے لئے کیا ہمیں سینہ سپر ہو کر نہ لڑنا چاہیئے۔ مغربی تہذیب کلچر اور تمدن کے کیا تقاضے ہیں۔ آزادی اور جمہوریت کو برقرار رکھنے کے لئے ہمیں کیا قدم اٹھانا چاہیئے۔ میں اس سلسلے میں حضور پرنور کے احکام کا منتظر ہوں۔

۲۵ر نومبر

موسیو ژاں ترپ کا خیال ہے کہ بنگال میں قحط نہیں ہے۔ موسیو فاں فنگ چینی قونصل کا خیال ہے کہ بنگال میں قحط ہے۔ میں شرمندہ ہوں کہ حضور نے مجھے جس کام کے لئے کلکتہ کے قونصل خانے میں تعینات کیا تھا۔ وہ کام میں گزشتہ تین ماہ میں بھی پورا نہ کر سکا۔ میرے پاس اس امر کی ایک بھی مصدقہ اطلاع نہیں ہے کہ بنگال میں قحط ہے یا نہیں ہے۔ تین ماہ کی مسلسل کاوش کے بعد بھی مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ صحیح ڈپلومیٹک پوزیشن کیا ہے۔ میں اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔ شرمندہ ہوں۔ معافی چاہتا ہوں۔

نیز عرض ہے کہ حضور پرنور کی منجھلی بیٹی کو مجھ سے اور مجھے حضور پرنور کی

منجھلی بیٹی سے عشق ہے۔ اس لئے کیا یہ بہتر ہوگا کہ حضور پُر نور مجھے کلکتے کے سفارتخانے سے واپس بُلالیں اور میری شادی اپنی بیٹی ——— میرا مطلب ہے حضور پر نور کی منجھلی بیٹی سے کردیں اور حضور پُر نور مجھے کسی ممتاز سفارت خانے میں سفیر اعلیٰ کا مرتبہ بخشش دیں۔ اس نوازشش کے لیے میں حضور پُر نور کا تا قیامت شکر گذار رہوں گا۔

ایڈتھ کے لیے ایک نیلم کی انگوٹھی ارسال کررہا ہوں۔ اسے مہاراجہ اشوک کی بیٹی پہنا کرتی تھی۔

میں ہوں جناب کا حقیر ترین خادم

ایف۔ بی۔ پٹاخہ

قونصل مملکتِ سانڈو گھاس۔ برائے کلکتہ

(۲)

وہ آدمی جو مرچکا ہے!

صبح ناشتے پر جب اُس نے اخبار کھولا تو اُس نے بنگال کے فاقہ کشوں کی تصاویر دیکھیں جو سڑکوں پر، درختوں کے نیچے، گلیوں میں، کھیتوں میں، بازاروں

میں، گھروں میں ہزاروں کی تعداد میں مر رہے تھے۔ آملیٹ کھاتے کھاتے اُس نے سوچا کہ ان غریبوں کی امداد کس طرح ممکن ہے۔ یہ غریب جو نا اُمیدی کی منزل سے آگے جا چکے ہیں اور موت کی بحرانی کیفیت سے ہمکنار ہیں۔ انہیں زندگی کی طرف واپس لانا۔ زندگی کی صعوبتوں سے دوبارہ آشنا کرنا۔ اُن سے ہمدردی نہیں دشمنی ہوگی

اُس نے جلدی سے اخبار کا ورق اُلٹا اور توس پر مربّہ لگا کر کھانے لگا۔ توس نرم گرم اور کرکرا تھا اور مربّے کی مٹھاس اور اسکی ہلکی سی تُرشی نے اُس کے ذائقے کو اور بھی نکھار دیا تھا جیسے غازے کا غبار عورت کے حُسن کو نکھار دیتا ہے۔ یکایک اُسے سینہہ کا خیال آیا۔ سینہہ ابھی تک نہ آئی تھی گو اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ صبح کے ناشتے پر اُس کے ساتھ موجود ہوگی، سو رہی ہوگی بے چاری! . . . .

اب کیا وقت ہوگا۔ اُس نے اپنی سونے کی گھڑی سے پوچھا جو اُس کی گوری کلائی میں جس پر سیاہ بالوں کی اک ہلکی سی ریشمیں لائن تھی - اک سیاہ ریشمی فیتے سے بندھی تھی۔ گھڑی، قمیص کے بٹن اور ٹائی کا پن، یہی تین زیور مرد پہن سکتا ہے اور عورتوں کو دیکھئے کہ جسم کو زیور سے ڈھک لیتی ہیں۔ کان کے لئے زیور، پاؤں کے لئے زیور، کمر کے لئے زیور، ناک کے لئے زیور، سر کے لئے زیور، گلے کے لئے زیور باہوں کے لئے زیور اور مرد بیچارے کے لئے صرف تین زیور بلکہ وہی سمجھئے

کیونکہ ٹائی کا پن اب فیشن سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ نہ جانے مردوں کو زیادہ زیور پہننے سے کیوں منع کیا گیا ہے۔ یہی سوچتے سوچتے وہ دلیا کھانے لگا۔ دلیے سے الائچی کی مہک اُٹھ رہی تھی۔ اُس کے نتھنے اُس کے پاکیزہ تعطر سے مصفّا ہو گئے اور یکایک اُس کے نتھنوں میں گذشتہ رات کے عطر کی خوشبو بس گئی۔ وہ عطر جو سینہہ نے اپنی ساڑھی اپنے بالوں میں لگا رکھا تھا۔ گذشتہ رات کا دلفریب رقص اُس کی آنکھوں کے آگے گھومتا گیا۔ گرانڈ ہوٹل میں ناچ ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔ اُس کا اور سینہہ کا جوڑا کتنا اچھا ہے۔ سارے ہال کی نگاہیں اُن پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کانوں میں گول گول طلائی آویزے پہنے ہوتے تھی جو اُس کی لوؤں کو چھپا رہے تھے۔ ہونٹوں پر جوانی کا تبسم اور میکس فیکٹر کی لالی کا معجزہ اور سینے کے سمن زاروں پر موتیوں کی مالا چمکتی، دمکتی، لچکتی، ناگن کی طرح سو بل کھاتی ہوئی، رمبا ناچ کوئی سینہہ سے سیکھے اُس کے جسم کی روانی اور ریشمی بنارسی ساری کا پُرشور بہاؤ جیسے سمندر کی لہریں چاندنی رات میں ساحل سے اٹھکیلیاں کر رہی ہوں، لہر آگے آتی ہے۔ ساحل کو چھو کر واپس چلی جاتی ہے۔ مدھم سی سرسراہٹ پیدا ہوتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ شور مدھم ہوتا جاتا ہے۔ شور قریب آ جاتا ہے، آہستہ آہستہ لہر چاندنی میں نہائے ہوئے ساحل کو چوم رہی ہے سینہہ کے لب نیم وا تھے جن میں دانتوں کی لڑی سپید موتیوں کی مالا کی طرح

لرزتی نظر آتی تھی . . . . یکایک ہال میں بجلی بجھ گئی اور وہ اور سفینہ ہونٹ سے ہونٹ ملائے، جسم سے جسم لگائے، آنکھیں بند کیے، رقص کے تال پر ناچتے رہے، ہائے اُن سروں کی مدھم سی روانی، وہ رسیلا میٹھا تموّج، رواں دواں، رواں دواں، ازلی موت کی سی پاکیزگی، نیند اور خمار اور نشہ جیسے جسم نہ ہو، جیسے زندگی نہ ہو، جیسے تُو نہ ہو، جیسے میں نہ ہوں، صرف ایک بوسہ ہو، صرف ایک گیت ہو، اک لہر ہو، رواں دواں رواں دواں . . . . اُس نے سب بچے قتلے کیے اور کانٹے سے اُٹھا کر کھانے لگا پیالی میں چلتے انڈے بیلتے ہوئے اُس نے سوچا، سفینہ کا جسم کتنا خوبصورت ہے اُس کی روح کتنی حسین ہے۔ اُس کا دماغ کس قدر کھوکھلا ہے . . . . . اُسے پُر مغز عورتیں بالکل پسند نہ تھیں، جب دیکھو اشتراکیت، سامراجیت، مارکسیت پر بحث کر رہی ہیں، آزادی، تعلیم نسواں، نوکری، یہ نئی عورت، عورت نہیں فلسفے کی کتاب ہے، بھئی ایسی عورت سے ملنے یا شادی کرنے کی بجائے تو یہی بہتر ہے کہ آدمی ارسطو پڑھا کرے۔ اُس نے بیقرار ہو کر اک بار پھر گھڑی پر نگاہ ڈالی، سفینہ ابھی تک نہ آئی تھی۔ چرچل اور سٹالین اور روزویلٹ طہران میں دُنیا کا نقشہ بدل رہے تھے اور بنگال میں لاکھوں آدمی بھوک سے مر رہے تھے دُنیا کو اطلانٹک چارٹر دیا جا رہا تھا اور بنگال میں چانول کا ایک دانہ بھی نہ تھا۔ اُسے

ہندوستان کی غربت پر اتنا ترس آیا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ہم غریب ہیں۔ بے بس ہیں، نادار ہیں، مجبور ہیں۔ ہمارے گھر کا وہی حال ہے۔ جو میر کے گھر کا حال تھا۔ جس کا ذکر اُس نے چوتھی جماعت میں پڑھا تھا اور جو ہر وقت فریاد کرتا رہتا تھا۔ جسکی دیواریں سیلی سیلی اور گری ہوئی تھیں اور جس کی چھت ہمیشہ ٹپک ٹپک کر روتی رہتی تھی۔ اُس نے سوچا ہندوستان بھی ہمیشہ روتا رہتا ہے۔ کبھی روٹی نہیں ملتی، کبھی کپڑا نہیں ملتا، کبھی بارش نہیں ہوتی، کبھی وبا پھیل جاتی ہے۔ اب بنگال کے بیٹوں کو دیکھو ہڈیوں کے ڈھانچے، آنکھوں میں ابدی افسردگی، لبوں پر بھکاریوں کی صدا، روٹی، چاول کا ایک دانہ، یکایک چائے کا گھونٹ اسے اپنے حلق میں تلخ محسوس ہوا اور اُس نے سوچا کہ وُہ ضرور اپنے ہم وطنوں کی مدد کرے گا۔ وہ چندہ اکٹھا کرے گا۔ سارے ہندوستان کا دورہ کرے گا اور چیخ چیخ کر اُس کے ضمیر کو بیدار کرے گا۔ دورہ، جلسے، والنٹیر، چندہ، اناج، اور زندگی کی اک لہر ملک میں اس سرے سے دوسرے سرے تک پھیل جائے گی۔ برقی رو کی طرح، یکایک اُس نے اپنا نام جلی سُرخیوں میں دیکھا۔ ملک کا ہر اخبار اُس کی خدمات کو سراہ رہا تھا اور خود اس اخبار میں جسے وُہ اب پڑھ رہا تھا۔ اُسے اپنی تصویر جھانکتی نظر آئی، کھدر کا لباس اور جواہر لال کی جیکٹ اور ہاں ویسی ہی خوبصورت مسکراہٹ، ہاں بس یہ

ٹھیک ہے، اُس نے بیرے کو آواز دی اور اُسے ایک اور آملیٹ تیار کرنے کو کہا۔ آج سے وُہ اپنی زندگی بدل ڈالے گا۔ اپنی حیات کا ہر لمحہ ان بھوکے، ننگے، پیاسے، مرتے ہوئے ہم وطنوں کی خدمت میں صرف کر دے گا۔ وُہ اپنی جان بھی اُن کے لئے قربان کر دے گا۔ یکایک اُس نے اپنے آپ کو پھانسی کی کوٹھڑی میں بند دیکھا۔ وُہ پھانسی کے تختے کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ اُس کے گلے میں پھانسی کا پھندا تھا۔ جلاد نے چہرے پر غلاف اُڑھا دیا اور اُس نے اُس کھردرے موٹے غلاف کے اندر سے چلا کر کہا، میں مر رہا ہوں، اپنے بھوکے پیاسے ننگے وطن کیلئے یہ سوچ کر اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر بھر آئے اور دو ایک گرم گرم نمکین بوندیں چائے کی پیالی میں بھی گر پڑیں اور اُس نے رومال سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ یکایک ایک کار پورچ میں رُکی اور موٹر کا پٹ کھول کر سینہہ مسکراتی ہوئی، سیڑھیوں پر چڑھتی ہوئی دروازہ کھول کر اندر آتی ہوئی، اُسے ہیلو کہتی ہوئی، اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر اُسکے رُخسار کو پھول کی طرح اپنے عطر بیز ہونٹوں سے چومتی ہوئی نظر آتی، بجلی، گرمی، روشنی مسرت، سب کچھ ایک تبسم میں تھا اور پھر زہر، سینہہ کی آنکھوں میں زہر تھا، اُس کے لبوں میں زہر تھا، اُس کے کمر کے لوچ میں زہر تھا۔ اُس کے لانبے قد میں زہر تھا۔ اُس کی زلفوں میں زہر تھا۔ اُس کی مدھم ہلکی سانس کی ہر جنبش میں زہر تھا۔ وُہ اجنبنا

کی تصویر تھی جس کے خد و خال مصوّر نے زہر سے اُبھارے تھے۔

اُس نے پوچھا۔ "ناشتہ کرو گی؟"

"نہیں، میں ناشتہ کر کے آئی ہوں۔" پھر سفینہ نے اُس کی پلکوں پر آنسو چھلکتے دیکھے، بولی۔ "تم آج اُداس کیوں ہو؟"

وہ بولا۔ "کچھ نہیں، یونہی۔ بنگال کے فاقہ کشوں کا حال پڑھ رہا تھا۔ سفینہ! ہمیں بنگال کے لئے کچھ کرنا چاہئے۔"

"POOR DARLINGS" سفینہ نے آہ بھر کر اور جیبی آئینے کی مدد سے اپنے ہونٹوں کی سُرخی ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگ اُن کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔ ماسوا اس کے کہ اُن کی روحوں کے لئے پرماتما سے شانتی مانگیں۔"

وہ خوشی سے اُچھل پڑا۔ "بس یہ بالکل ٹھیک ہے، ہر مندر میں اور ہر مسجد میں مرتے ہوئے بنگالیوں کے لئے، بھوکے ننگے بنگالیوں کے لئے دعا مانگی جائے۔ کس قدر حسین خیال ہے، سفینہ تم سمجھدار ہوتی جا رہی ہو۔"

"کانوونٹ کی تعلیم ہے نا آخر؟" اُس نے اپنے خوبصورت سپید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

وہ سوچ کر بولا۔ "ہمیں ——— ایک ——— ریزولیوشن بھی پاس کرنا چاہئے۔"

"وُہ کیا ہوتا ہے؟" سینہہ نے نہایت معصومانہ انداز میں پوچھا اور اپنی ساڑھی کا پلّو درست کرنے لگی۔

"اب یہ تو مجھے ٹھیک طرح سے معلوم نہیں۔" وُہ بولا "اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جب کبھی ملک پر کوئی آفت آتی ہے۔ ریزولیوشن ضرور پاس کیا جاتا ہے، سُنا ہے۔ ریزولیوشن پاس کر دینے سے سب کام خود بخود ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ... میرا خیال ہے، میں ابھی ٹیلیفون کر کے شہر کے کسی رہنما سے ریزولیوشن کے بارے میں پُوچھتا ہوں"۔

"رہنے بھی دو ڈارلنگ۔" سینہہ نے مسکرا کر کہا۔ "دیکھو، جُوڑے میں پھُول ٹھیک سجا ہے؟"

اُس نے نیلراج کی نازک ڈنڈی کو جُوڑے کے اندر تھوڑا سا دبا دیا۔ "بے حد پیارا پھول ہے، نیلا، جیسے کرشن کا جسم، جیسے ناگ کا پھَن، جیسے زہر کا رنگ!"

پھر سوچ کر بولا۔ "نہیں کچھ بھی ہو، ریزولیوشن ضرور پاس ہونا چاہئے۔ میں ابھی ٹیلیفون کرتا ہوں۔"

سینہہ نے اُسے اپنے ہاتھ کی اک ہلکی سی جنبش سے روک لیا۔ گُداز انگلیوں کا لمس اک ریشمی رَو کی طرح اُس کے جسم کی رگوں اور عروق میں پھیلتا گیا۔ رواں رواں

رواں دواں . . . . . اس لہر نے اُسے بالکل بے بس کر دیا اور وُہ ساحل کی طرح بے حس و حرکت ہو گیا۔

"آخری رمبا کتنا اچھا تھا!" سینہہ نے اُسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

اور اُس کے ذہن میں پھر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ بنگالی فاقہ مستوں کی قطاریں اندر گھستی چلی آ رہی تھیں۔ وُہ انہیں باہر نکالنے کی کوشش میں کامیاب ہوتا، بولا۔ "میں کہتا ہوں سینہہ، ریزولیوشن پاس کرنے کے بعد ہمیں کیا کرنا چاہئے . . . . . میرے خیال میں اُس کے بعد ہمیں قحط زدہ علاقے کا دورہ کرنا چاہئیے کیوں؟"

"بہت دماغی محنت سے کام لے رہے ہو اس وقت۔" سینہہ نے تشویشناک لہجے میں کہا۔ "بیمار ہو جاؤ گے! جانے دو۔ وُہ بے چارے تو مر رہے ہیں۔ اُنہیں آرام سے مرنے دو۔ تم کیوں مفت میں پریشان ہوتے ہو۔"

"قحط زدہ علاقے کا دورہ کروں گا، یہ ٹھیک ہے سینہہ، تم بھی چلو گی نا؟"

"کہاں؟"

"بنگال کے دیہات میں۔"

"ضرور ——— مگر وہاں کس ہوٹل میں ٹھہریں گے؟"

ہوٹل کا ذکر سُن کر اُس نے اپنی تجویز کو وہیں اپنے ذہن میں قتل کر ڈالا اور قبر کھود کر وہیں اندر دفنا دیا۔ خدا جانے اُس کا ذہن اس قسم کی کتنی ناپختہ تمناؤں اور آرزوؤں کا قبرستان بن چکا تھا۔

وُہ بچے کی طرح رُوٹھا ہوا تھا۔ اپنی زندگی سے بیزار۔

سینہہ نے کہا: "میں تمہیں بتاؤں۔ ایک شاندار ناچ پارٹی ہو جائے گرانڈ میں۔ دو سو روپیہ فی ٹکٹ اور شراب کے پیسے الگ رہے اور جو رقم اس طرح اکٹھی ہو جائے وُہ بنگال ریلیف فنڈ میں۔ ۔ ۔ !"

"ارے ررررے۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اُس نے کرسی سے اچھل کر سینہہ کو اپنے گلے سے لگا لیا "اے جانِ تمنّا، تمہاری روح کتنی حسین ہے"

"جبھی تم نے کل رات آخری رمبا کے بعد مجھ سے شادی کی درخواست کی تھی" سینہہ نے ہنسکر کہا۔

"اور تم نے کیا جواب دیا تھا؟" اُس نے پوچھا

"میں نے انکار کر دیا تھا" سینہہ نے شرماتے ہوئے کہا

"بہت اچھا کیا" وہ بولا "میں اُس وقت شراب کے نشے میں تھا"

کار جیونی رام، سیونی رام، پیپونی رام، بھوندو مل تمباکو فروش کی دُکان پر رُکی، سامنے گرانڈ ہوٹل کی عمارت تھی، کسی مغلئی مقبرے کی طرح وسیع اور پُرشکوہ!

اُس نے کہا: "تمہارے لئے کون سے سیگرٹ لے لوں؟"

"روز، مجھے اُس کی خوشبو پسند ہے" سینہہ نے کہا

"امی دُو دن کھیتے پائی نی کی چھو کھیتے داؤ"

ایک بنگالی لڑکا دھوتی پہنے ہوئے بھیک مانگ رہا تھا۔ اُس کیساتھ ایک چھوٹی سی لڑکی تھی۔ میلی کچیلی، خاک میں اَٹی ہوئی، آنکھیں غلیظ اور ادھ مندی سینہہ نے کراہت سے مُنہ پھیر لیا۔

"میم صاحب ایکٹا پوئے شا داؤ" لڑکا گڑگڑا رہا تھا۔

"تو میں روز ہی لے آتا ہوں" یہ کہکر وُہ جیونی رام، سیونی رام، پیپونی رام، بھوندو مل تمباکو فروش کی دُکان کے اندر غائب ہوگیا۔

سینہہ کار میں بیٹھی رہی، لیکن بنگال کی بھوک کی مکھیاں اُس کے دماغ میں بھنبھناتی رہیں۔ میم صاحب ... میم صاحب ... میم صاحب۔ میم صاحب نے دو ایک بار اُنہیں جھڑک دیا۔ لیکن بھوک جھڑکنے سے کہاں

دُور ہوتی ہے۔ وُہ اَور بھی قریب آجاتی ہے۔ لڑکی نے ڈرتے ڈرتے اپنے ننھے ننھے ہات سنیہہ کی ساری سے لگا دیئے اور اس کا پلّو پکڑ کر لجاجت سے کہنے لگی "میم صاحب...... میم صاحب... میم صاحب بورڈ دکھیدے پیچھ۔ کی چھُو وا"

سنیہہ اب بالکل زِچ ہو گئی تھی۔ اُس نے جلدی سے پلّو چھڑا لیا۔ اتنے میں وُہ آ گیا۔ سنیہہ بولی "یہ گداگر کیوں اس قدر پریشان کرتے ہیں۔ کارپوریشن کوئی انتظام نہیں کر سکتی ہے کیا؟.... جب سے تم دکان کے اندر داخل ہوئے ہو..... یہ...."

اُس نے گداگر لڑکے کو زور سے چپت لگائی اور چھوٹی لڑکی کو چٹیا سے پکڑ کر زور سے پرے دھکیل دیا اور کُودم سے کار گھما کر گرانڈ ہوٹل کے پورچ میں لے آیا۔

بنگالی لڑکی جو اک جھٹکے کے ساتھ دور جا پڑی تھی۔ وہیں فرشِ خاک پر گر کر ہنسنے لگی۔ لڑکے نے اپنی چھوٹی بہن کو اُٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "نمار کو نھائے لاگے نے تو؟"

لڑکی سسکنے لگی......

ناچ عروج پر تھا۔

سینیھہ اور وہ ایک میز کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے

سینیھہ نے پوچھا "کتنے روپے اکٹھے ہوئے؟"

"ساڑھے چھ ہزار!"

"ابھی تو ناچ عروج پر ہے۔ صبح چار بجے تک ....

"نو ہزار روپیہ ہو جائیگا" وہ بولا

"آج تم نے بہت کام کیا ہے" سینیھہ نے اُس کی اُنگلیوں کو چھُو کر کہا

"کیا پیو گی؟"

"تم کیا پیو گے؟"

"جن اور سوڈا!"

سینیھہ بولی "بیرا، صاحب کے لئے ایک لارج جن لاؤ اور سوڈا۔"

"اور تم؟"

"ناچتے ناچتے اور پیتے پیتے پریشان ہو گئی ہوں۔"

"اپنے وطن کی خاطر سب کچھ کرنا پڑتا ہے ڈارلنگ" اُس نے سینیھہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"اوہ مجھے امپیریلزم سے کس قدر نفرت ہے"۔ سینیہہ نے پرخلوص لہجے میں کہا: "بیرا، میرے لئے ایک "ورجن" لاؤ"۔

بیرے نے "ورجن" کا جام لا کر سامنے رکھدیا۔ جن کی سپیدی میں ورموتھ کی لالی اس طرح نظر آتی تھی۔ جیسے سینیہہ کے عنبریں چہرے پر اُس کے لب لعلیں سینیہہ نے جام ہلایا اور کاکٹیل کا رنگ شفقی ہوگیا۔ سینیہہ نے جام اُٹھایا اور بجلی کی روشنی نے اُس کے جام میں گھُل کر یاقوت کی سی چمک پیدا کردی۔ یاقوت سینیہہ کی اُنگلیوں میں تھرّا رہا تھا۔ یاقوت جو خون کی طرح سُرخ تھا۔

..... ناچ عروج پر تھا اور وہ اور سینیہہ ناچ رہے تھے۔ ایک گت، ایک تال، ایک لے، سمندر دُور... بہت دور... کہیں نیچے چلا گیا تھا اور زمین گم ہوگئی تھی اور وہ ہوا میں اُڑ رہے تھے اور سینیہہ کا چہرہ اُس کے کندھے پر تھا اور سینیہہ کے بالوں میں بسی ہوئی خوشبو اُسے بلا رہی تھی۔ بال بنانے کا انداز کوئی سینیہہ سے سیکھے۔ یہ عام ہندوستانی لڑکیاں تو بیچ میں سے یا ایک طرف سے مانگ نکال لیتی ہیں اور تیل چپڑ کر بالوں میں کنگھی کر لیتی ہیں۔ بہت ہوا تو دو چوٹیاں کر ڈالیں اور اپنی دانست میں فیشن

کی شہزادی بن بیٹھیں۔ مگر یہ سینہہ ہی جانتی ہے کہ بالوں کی ایک الگ ہستی ہوتی ہے۔ اُن کا اپنا حسن ہوتا ہے۔ اُن کی مشاطگی عورت کی نسائیت کی معراج ہے جیسے کوئی مصور سادہ تختے پر حسن کے نازک خطوط کھینچتا ہے۔ اُسی طرح سینہہ بھی اپنے بال سنوارتی تھی۔ کبھی اُس کے بالوں میں کنول کے پھول بن جاتے کبھی کانوں پر ناگن کے پھن، وہ کبھی چاند کا ہالہ ہو جاتے، کبھی ان بالوں میں ہمالیہ کی وادیوں کے سے نشیب و فراز پیدا ہو جاتے۔ سینہہ اپنے بالوں کی آرائش میں ایسے جمالیاتی ذوق اور جودتِ طبع کا ثبوت دیتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا سینہہ کی عقل اُس کے دماغ میں نہیں، اُس کے بالوں میں ہے!.....

ناچ عروج پر تھا اور یہ بال اُس کے رخساروں سے مس ہو رہے تھے اُس کے رگ و پے میں رقص کی روانی تھی اور اُس کے نتھنوں میں اُس خوشبو کا تعطر، اُس کا جسم اور سینہہ کا جسم پگھل کر ایک ہو گئے تھے اور ایک شعلے کی طرح ساز کی دھن پر لہرا رہے تھے۔ ایک شعلہ، ایک پھن، ایک زہر... ایک لہر ... لہریں... لہریں، ہلکی ہلکی، گرم مدور سی لہریں ساحل کو چومتی ہوئی، لوریاں دے کر تھپک تھپک کر سلاتی ہوئی، سو جاؤ، موت میں زندگی ہے۔ حرکت نہ

کرو، سکون ہی زندگی ہے، آزادی نہ طلب کرو، غلامی ہی زندگی ہے۔ چاروں طرف ہال میں ایک میٹھا سا زہر بسا ہوا تھا۔ شراب میں...... عورت میں...... ناچ میں...... سینہہ کے نیلے سائے میں، اُس کے پُراسرار تبسم میں اُس کے نیم وا لبوں کے اندر کانپتی ہوئی موتیوں کی لڑی میں زہر...... زہر اور زمین اور سینہہ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے، بند ہوتے ہوئے لب! اور نغمے کا زہر، سو جاؤ...... سو جاؤ...... سو جاؤ...... یکایک ہال میں بجلی بجھ گئی اور وہ سینہہ کے ہونٹوں سے ہونٹ ملائے، اُس کے جسم سے جسم لگائے، مدھم مدھم دھیمے دھیمے، ہولے ہولے ناچ کے جھولے میں گہرے، گداز، گرم آغوش میں کھو گیا، بہہ گیا، سو گیا، مر گیا......!

(۳)

وہ آدمی جو ابھی زندہ ہے

...... میں مر چکا ہوں؟ میں زندہ ہوں؟...... میری پھٹی پھٹی لبے نور

بے بصر آنکھیں آسمان کی پہنائیوں میں کسے ڈھونڈ رہی ہیں؟ آؤ پل بھر کے لئے اس قونصل خانے کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاؤ اور میری داستان سنتے جاؤ، جب تک پولیس، سیوا سمتی یا انجمن خدام المسلمین میری لاش کو یہاں سے اٹھا نہ لیجائیں تم میری داستاں سُن لو، نفرت سے مُنہ نہ پھیرو۔ میں بھی تمہاری طرح گوشت پوست کا بنا ہوا انسان ہوں۔ یہ سچ ہے کہ اب میرے جسم پر گوشت کم اور پوست زیادہ نظر آتا ہے اور اس میں بھی سڑاند پیدا ہو رہی ہے اور ناک سے پانی کے بلبلے سے اُٹھ رہے ہیں۔ لیکن یہ تو سائنس کا ایک معمولی سا عملیہ ہے۔ تمہارے جسم اور میرے جسم میں صرف اتنا فرق ہے کہ میرے دل کی حرکت بند ہو گئی ہے۔ دماغ نے کام کرنے سے انکار کر دیا ہے اور پیٹ ابھی تک بھوکا ہے یعنی اب بھی اس قدر بھوکا ہے کہ میں سوچتا ہوں، اگر تم چانول کا ایک ہی دانہ میرے پیٹ میں رکھدو تو وہ پھر سے کام کرنا شروع کر دے گا۔ آزما کر دیکھ لو۔ کدھر چلے؟ ٹھہرو، ٹھہرو، نہ جاؤ، میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔ تم گھبرا گئے؛ کلکتے کے مُردے بھی بھیک مانگتے ہیں۔ خدا کے لئے نہ جاؤ۔ میری داستان سن لو، ہاں ہاں اس چانول کے دانے کو اپنی مٹھی میں سنبھال کر رکھو۔ میں اب تم سے بھیک نہیں طلب کروں گا۔ کیونکہ میرا جسم اب گل چکا ہے۔ اسے چانول کے دانے کی ضرورت نہیں رہی اب یہ

خود ایک دن چانول کا دانہ بن جائے گا۔ نرم نرم گداز مٹی میں جس کے ہر مسام میں ندی کا پانی رچا ہو گا۔ یہ جسم گھُل جائے گا۔ اپنے اندر دھان کی پنیری کو اُگتے ہوئے دیکھے گا اور پھر یہ ایک دن پانی کی پتلی تہ سے اوپر سر نکال کر اپنے سبز سبز خوشوں کو ہوا میں لہرائے گا، مسکرائے گا، ہنسے گا، کھلکھلائے گا۔ کرنوں سے کھیلے گا۔ چاندنی میں نہائیگا۔ پرندوں کے چہچہوں اور خنک ہوا کے جھونکوں کے شہد آگیں بوسوں سے اس کی حیات کے بند بند میں اک نئی رعنائی، اک نیا حسن، اک نیا نغمہ پیدا ہو گا۔ چانول کا ایک دانہ . . . . ہر خوشے کے دھان کے خول میں چانول کا ایک دانہ ہو گا، صدف کے موتی کی طرح اُجلا، معصوم اور خوبصورت . . . . آج میں تم سے ایک راز کی بات کہتا ہوں، دُنیا کا سب سے بڑا راز، وہ راز جو تمہیں ایک مُردہ ہی بتا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا سے دعا کرو، وہ تمہیں انسان نہ بنائے، چانول کا ایک دانہ بنا دے۔ اُس خالق باری کے سامنے گڑگڑاؤ، منتیں کرو، دعا مانگو، فاقے کرو، چلہ کاٹو، جس طرح ہو سکے یہ کوشش کرو، کہ وہ تمہیں انسان نہ بنائے، چانول کا ایک دانہ بنا دے، گو زندگی انسان میں بھی ہے، اور چانول کے دانے میں بھی، لیکن جو زندگی چانول کے دانے میں ہے۔ وہ انسان کی زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ معصوم ہے، خوبصورت ہے،

پاک ہے، اور انسان کے پاس بھی اُس زندگی کے سوا اور ہے کیا؟ انسان کی جائداد اُس کا جسم، اس کا باغ، اُس کا گھر نہیں بلکہ یہی اُس کی زندگی ہے اُس کا اپنا آپ، وُہ ان سب چیزوں کو اپنے لئے استعمال کرتا ہے، اپنے جسم کو، اپنی زمین کو، اپنے گھر کو، اُس کے دل میں چند تصویریں ہوتی ہیں، چند خیال آگ کے چند انگارے، ایک مسکراہٹ، وُہ انہیں پر جیتا ہے اور جب مر جاتا ہے تو صرف انہیں اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔

چاول کے دانے کی زندگی تم دیکھ چکے۔ اب آؤ، میں تمہیں اپنی زندگی دکھاؤں، نفرت سے منہ نہ پھیر لو، کیا ہوا اگر میرا جسم مردہ ہے، میری روح تو زندہ ہے، میری روح تو بیدار ہے اور پیشتر اس کے کہ وُہ بھی سو جائے وُہ تمہیں اُن چند دنوں کی کہانی سُنانا چاہتی ہے، جب روح اور جسم ایک ساتھ چلتے پھرتے ناچتے گاتے ہنستے بولتے تھے، روح اور جسم، دو میں مزا ہے، دو میں حرکت ہے، دو میں زندگی ہے، دو میں تخلیق ہے۔ جب دھرتی اور پانی ملتے ہیں تو چاول کا دانہ پیدا ہوتا ہے۔ جب عورت اور مرد ملتے ہیں تو اک خوبصورت ہنستا ہوا بچہ ظہور میں آتا ہے۔ جب روح اور جسم ملتے ہیں تو زندگی پیدا ہوتی ہے، آؤ میں تمہیں اپنے دو کی داستان سناؤں، وُہ دو جو اب الگ

ہو چکے، روح اور جسم، دونوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ جب جسم الگ ہو جاتا ہے تو اس میں سڑاند پیدا ہوتی ہے اور جب روح الگ ہوتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے۔ اگر غور سے دیکھو گے تو تمہیں اس دھوئیں میں میرے ماضی کی تصاویر لرزتی، دمکتی، گم ہوتی ہوئی نظر آئیں گی۔ . . . یہ تجلّی کیا تھی . . . . یہ میری بیوی کی مسکراہٹ تھی۔ . . . یہ میری بیوی ہے . . . . شرماؤ نہیں، سامنے آ جاؤ، اے جانِ تمنّا! . . . . اسے دیکھا آپ نے؟ یہ سانولی سلونی مورت یہ گھنے بال کمر تک لہراتے ہوئے، یہ شرمیلا تبسّم، یہ جُھکی جُھکی حیران آنکھیں، یہ آج سے تین سال پہلے کی لڑکی ہے، جب میں نے اُسے اناپارا کے ساحلی گاؤں میں سمندر کے کنارے دوپہر کی سوئی ہوئی فضا میں دیکھا تھا۔ . . . میں ان دنوں اجات قصبے میں زمیندار کی لڑکی کو ستار سکھاتا تھا اور یہاں اناپارا میں دو دن کی چھٹی لے کر اپنی بڑی موسی سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ یہ خاموش گاؤں، سمندر کے کنارے، بانسوں کے جھنڈ اور ناریل کے درختوں سے گھرا ہوا اپنی اُداسی میں گم تھا۔ نہ جانے ہمارے بنگالی گاؤں میں اتنی اُداسی کہاں سے آ جاتی ہے، دھرتی خاموش ہے، سامنے سمندر، اتھاہ سمندر پھیلا ہوا ہے۔ فضا رکی ہوئی ہے۔ بانس کے چھپروں کے اندر

اندھیرا ہے، سیلن ہے، بانس کی ہانڈیوں میں چانول دبے پڑے ہیں مچھلی کی بُو ہے۔ تالاب کا پانی کائی سے سبز ہے۔ دھان کے کھیتوں میں پانی ٹھہرا ہوا ہے۔ ناریل کا درخت اک نکیلی برچھی کی طرح آسمان کے سینے میں گہرا گھاؤ ڈالے کھڑا ہے۔ ہر جگہ، ہر وقت درد کا احساس ہے، ٹھہراؤ کا احساس ہے ۱
حزن کا احساس ہے۔ سکون، جمود اور موت کا احساس ہے، یہ اُداسی جو تم ہماری محبت، ہماری سماج، ہمارے ادب اور نغمے میں دیکھتے ہو۔ یہ اُداسی ہمارے گاؤں سے شروع ہوتی ہے اور پھر ساری دھرتی پر پھیل جاتی ہے

جب میں نے اُسے پہلے پہل دیکھا تو یہ مجھے اک جل پری کی طرح حسین نظر آئی۔ یہ اُس وقت پانی میں تیر رہی تھی اور میں ساحل کی ریت پر ٹہل رہا تھا اور اک نئی دھن میں سوچ رہا تھا۔ یکایک میرے کانوں میں اک شیریں نسوانی آواز آئی "پرے ہٹ جاؤ، میں کنارے پر آنا چاہتی ہوں۔" میں نے دیکھا آواز سمندر میں سے آ رہی تھی۔ لانبے ریشمیں گھنے بال، اور جل پری کا چہرہ ہنستا ہوا، مسکراتا ہوا اور دُور پرے اُفق پر ایک کشتی جس کا مٹیالا بادبان دھوپ میں سونے کے پترے کی طرح چمکتا نظر آ رہا تھا۔

میں نے کہا "کیا تم سات سمندر پار سے آئی ہو؟"

وُہ ہنس کر بولی: "نہیں میں تو اسی گاؤں میں رہتی ہوں۔ وُہ کشتی میرے باپ کی ہے، وُہ مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔ میں اُس کے لئے کھانا لائی ہوں . . .

. . . ذرا دیکھو کر چلو۔ تمہارے قریب ناریل کے تنے کے پاس کھانا رکھا ہے اور وہاں میری ساڑھی بھی ہے۔"

یہ کہکر اُس نے پانی میں ایک ڈُبکی لگائی اور پھر لہروں میں پھُوٹتے ہوئے بُلبلوں کی افشاں سی بناتی ہوئی کنارے کے قریب آگئی۔ بولی: "پرے ہٹ جاؤ اور وُہ دھوتی مجھے دے دو۔"

میں نے کہا: "ایک شرط پر۔"

"کیا ہے!"

"میں بھی مچھلی بھات کھاؤں گا۔ بہت بھُوک لگی ہے۔"

وُہ ہنسی، اور پھر سَن سے ایک تیر کی طرح پانی کے سینے کو چیرتی ہوئی دُور چلی گئی۔ جہاں اُس کے چاروں طرف سورج کی کرنوں نے پانی میں طلائی جال بُن رکھا تھا اور اُس کا نازک چھریرا سُبک اندام جسم اک ننھی کشتی کی طرح اُن پانیوں میں گھومتا نظر آیا، پھر وُہ گھومی اور سیدھی کنارے کو ہولی۔ لیکن اب ہولے ہولے آرہی تھی، آہستہ آہستہ، ڈگمگ ڈگمگ . . . .

مَیں نے پُوچھا "کیا ہوا ہے تمہیں ؟"

بولی "آج کل بھات بہت مہنگا ہے۔ روپے کا دو سیر ہے۔ میں تمہیں بھات نہیں کھِلا سکتی"۔

"پھر میں کیا کروں، مجھے تو بھُوک . . . . . "

"سمندر کا پانی پیو ——" اُس نے شوخی سے کہا اور پھر ایک ڈبکی لگائی

جب وہ میری بیوی بن کر میرے گھر آئی تو بھات روپے کا دو سیر تھا اور میری تنخواہ پچاس روپے ماہانہ تھی۔ بیاہ سے پہلے مجھے خود صبح اُٹھ کر بھات پکانا پڑتا تھا۔ کیونکہ زمیندار کی بیٹی سکول جاتی تھی اور مجھے علی الصبح اُسے ستار سکھانے کے لیے جانا پڑتا۔ شام کو بھی اُسے دو گھنٹے تک ریاض کراتا تھا۔ دن میں بھی زمیندار بُلا لیتا تھا "ستار سُناؤ جی۔ جی بہت اُداس ہے!"

پھر یہ ننھی سی بچّی ہمارے ہاں آ گئی . . . . اِدھر آؤ بیٹا . . . . ہاں مسکرا دو، ہنس پڑو۔ ان سے کہدو میں بالکل معصوم ہوں، انجان ہوں، میری عُمر دو سال کی بھی نہیں اور مجھے جھُنجھنا بجانے، گڑیا سے کھیلنے اور ماں کی

چھاتی سے لگ کر دودھ پینے اور دودھ پیتے پیتے اُس کے سینے سے اپنے ننھے مُنھے ہات چمٹائے اُس کے گداز آغوش میں سو جانے کا بہت شوق ہے۔ مَیں اتنی پاکیزہ ہوں کہ خود بول بھی نہیں سکتی، بات بھی نہیں کرتی، صرف مڑ مڑ تکتی ہوں، اُس آسمان کی طرف جس کے مالک نے مجھے اس زمین پر بھیجا ہے کہ مَیں اپنے ماں باپ کے دل میں انسانی مسرّت کی کرن بن کر رہوں اور بانس کی میلی سیلی چھپریا میں خوشی کا گیت بن کر گھر کے آنگن کو اپنی ہنسی کے نُور سے بھر دوں ... مسکرا دو بٹیا!

.... ہاں تو جب یہ ننھی سی بچی پیدا ہوئی، اُس وقت بھات روپے کا ایک سیر تھا، لیکن ہم لوگ اس پر بھی خُدا کا شکر بجا لاتے تھے جس نے چاول کے دانے بنائے اور زمیندار کے پاؤں چومتے تھے، جس نے ہمیں چاول کے دانے کھلائے اور بیچ بات تو یہ ہے کہ بنانے اور کھانے کے بیچ میں جو چیز حائل ہے، وہ بجائے خود اک پوری تاریخ ہے۔ انسانی زندگی کے ہزاروں سال کی داستان ہے۔ اُس کی تہذیب و تمدّن، مذہب، اوہام، فلسفہ اور ادب کی تفسیر ہے۔ بنانا اور کھانا بہت سہل الفاظ ہیں، لیکن ذرا اس گہری خلیج کو بھی دیکھیے، جو اِن دو لفظوں کے درمیان حائل ہے۔

بھات روپے کا ایک سیر تھا۔

پھر بھات روپے کا تین پاؤ ہوا۔

پھر بھات روپے کا آدھ سیر ہوا۔

پھر بھات روپے کا ایک پاؤ ہوا۔

اور پھر بھات —— معدوم ہوگیا۔

پھر درختوں پر سے آم، جامن، کٹہل، شریفے، کیلے ختم ہوگئے ہتاڑی ختم، ساگ سبزی ختم، مچھلی ختم، ناریل ختم، کہتے ہیں زمیندار کے پاس منوں اناج تھا اور بنئے کے پاس بھی، لیکن کہاں تھا، کس جگہ تھا؟ کسی کو معلوم نہ تھا۔ اناج حاصل کرنے کی سب تدبیریں رائگاں گئیں۔ گڑگڑانا ہنہنیں کرنا خدا سے دعا مانگنا، خدا کو دھمکی دینا، سب کچھ ختم ہوگیا۔ صرف اللہ کا نام باقی تھا یا زمیندار اور بنئے کا گھر۔

اناج کی گرانی دیکھ کر زمیندار نے میرا ستار سکھانا بند کردیا۔ جب لوگ بھوک کے مر رہے ہوں اُس وقت نغمے کی کیسے سوجھتی ہے۔ پچاس روپے دے کر ستار کون سیکھتا ہے!

بھوک، نا اُمیدی، اور بلکتی ہوئی بچی!

مَیں نے اپنی بیوی سے کہا "ہم کلکتے چلیں گے، وہاں لاکھوں لوگ بستے ہیں۔ شاید وہاں کوئی کام چل جائے!"

"چلو کلکتے چلو!"

"چلو کلکتے چلو!" جیسے یہ صدا سارے گاؤں والوں نے سُن لی۔ گاؤں کی سماجی زندگی اک بند کی طرح مضبوط ہوتی ہے۔ یکایک "چلو کلکتے چلو" کی صدا نے اس بند کا ایک کنارہ توڑ دیا اور سارا گاؤں اس سوراخ کے راستے سے بہہ نکلا... چلو کلکتے چلو... ہر لب پر یہی صدا تھی ... چلو کلکتے چلو...!

سینکڑوں، ہزاروں آدمی اس سڑک پر چل رہے تھے، یہ سڑک جو کلکتے کے مضافات میں سے بنگال کے دُور دُور پھیلے ہوتے گاؤں میں سے گھومتی ہوئی آ رہی تھی۔ یہ سڑک جو ان انسانوں کے لئے شاہ رگ کی طرح تھی... چلو کلکتے چلو... چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ خاک و خون میں اٹی ہوئی، لتھڑی ہوئی اور کلکتے کی لاش کی طرف جا رہی تھیں۔ ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں اور اس قافلے کے اُوپر گدھ گھوم رہے تھے اور ساری فضا میں مُردہ

گوشت کی بُو تھی۔ چیخیں تھیں فضا میں، آہ و بکا اور آنسوؤں کی سیلن، اور لاشیں جو سڑک پر طاعون زدہ چوہوں کی طرح بکھری پڑی تھیں۔ لاشیں جنہیں گدھوں نے کھا لیا تھا اور اب اُن کی ہڈیاں دھوپ میں چمکتی نظر آتی تھیں۔ لاشیں جنہیں گیدڑوں نے کھا لیا تھا۔ لاشیں جنہیں کتّے ابھی تک کھا رہے تھے۔ لیکن چیونٹیاں آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ یہ چیونٹیاں بنگال کے ہر حصّے سے بڑھتی چلی آ رہی تھیں اور اُن کے ذہن میں کلکتے کی لاش تھی۔ کوئی کسی کا پُرسانِ حال کیسے ہوتا۔ ان لاکھوں آدمیوں میں سے ہر شخص اپنے لئے لڑ رہا تھا جی رہا تھا۔ مر رہا تھا۔ موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ شاید ایسا ہی ہوتا تھا۔ ان لوگوں کی موت اسی طرح لکھی تھی۔ ان ہزاروں، لاکھوں چیونٹیوں کی موت، پیٹ میں بھوک کا دوزخ اور آنکھوں میں یاسیت کی مہیب تاریکی لئے، یہ انسانی چیونٹیاں اپنے بوجھل قدموں سے سڑک پر چل رہی تھیں۔ لڑ رہی تھیں۔ کراہ رہی تھیں۔ مر رہی تھیں۔ کاش ان انسانوں میں چیونٹیوں کا سا ہی نظم و نسق ہوتا تو بھی یہ صورتِ حال نہ ہوتی۔ چیونٹیاں اور چوہے بھی اس بُری طرح نہیں مرتے.....!

راستے میں کہیں کہیں خیرات بھی مل جاتی تھی۔ ہندو ہندوؤں کو اور

مسلمان مسلمانوں کو خیرات دیتے تھے۔ لیکن خیرات سے کب کسی کا پیٹ بھرتا ہے۔ خیرات تو زندگی عطا نہیں کرتی۔ خیرات ہمیشہ دھوکا دیتی ہے۔ خیرات کرنے والے کو بھی اور خیرات لینے والے کو بھی۔ ہمیں بھی خیرات ملی اور ایک دن ایک سالم ناریل ہاتھ لگ گیا۔ بچی کب سے دودھ کے لئے چلا رہی تھی اور ماں کی چھاتیاں اُس دھرتی کی طرح تھیں جس پر مدت سے پانی کی اک بوند نہ برسی ہو۔ اُس کا پھول کا سا جسم جھلس گیا تھا۔ وہ بار بار بچی کو پچکارنے کے لئے اُس کے ہاتھ میں جھنجھنا دے دیتی۔ بچی کو یہ جھنجھنا بہت پسند تھا۔ وہ اُسے ہر وقت کلیجے سے لگائے رکھتی۔ اس وقت بھی وہ اس جھنجھنے کو زور سے اپنی مٹھی میں دبائے اپنی ماں کے شانے سے لگی بلک رہی تھی اور روئے جاتی تھی۔ جیسے کوئی بے بس زخمی جانور برابر چیخے جاتا ہے اور جب تک اُسے موت نہیں آتی، برابر اُسی طرح، اُسی انداز میں، اُسی لے میں بین کئے جاتا ہے،

. . . لیکن اچھا ہوا۔ عین اُسی روز ہمیں ایک سالم ناریل مل گیا۔ ناریل کا دودھ ہم نے بچی کو پلایا اور ناریل ہم دونوں نے کھایا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے سارا جہان جی اُٹھا ہو!

. . . .

اب کسی کے پاس کچھ نہ تھا۔ سب تجارت ختم ہو چکی تھی۔ صرف گوشت و پوست کی تجارت ہو رہی تھی۔ اُس کے تاجر شمالی ہند سے آتے تھے۔ ان میں یتیم خانوں کے منیجر تھے جنہیں یتیموں کی تلاش تھی۔ ماں باپ اپنے ننھے منھے بچے اور چھوٹے چھوٹے لڑکے اُن کے حوالے کر کے انہیں یتیم بنا رہے تھے۔ دراصل غربت ہی تو یتیم پیدا کرتی ہے۔ ماں باپ کا زندہ رہنا یا مر جانا ایک خدائی امر ہے۔ ان تاجروں میں دوھوا آشرموں کے کارکن بھی تھے اور خالص تاجر جو ہر قسم کی اخلاقی، مذہبی، تمدنی ریاکاری سے الگ ہو کر خالص تجارت کرتے تھے۔ نوجوان لڑکیاں بکریوں کی طرح ٹٹولی جاتی تھیں۔

مال اچھا ہے

رنگ کالا ہے

ذرا دُبلی ہے

مُنہ پر چیچک ہے

ارے اس کی تو بالکل ہڈیاں نکل آئی ہیں۔

چلو، خیر، ٹھیک ہے

دس روپے دے دو

خاوند بیویوں کو، مائیں لڑکیوں کو، بھائی بہنوں کو فروخت کر رہے تھے، یہ وُہ لوگ تھے جو اگر کھاتے پیتے ہوتے تو ان تاجروں کو جان سے مار دینے پر تیار ہو جاتے۔ لیکن اب یہی لوگ نہ صرف انہیں بیچ رہے تھے بلکہ بیچتے وقت خوشامد بھی کرتے تھے۔ دکانداروں کی طرح اپنے مال کی تعریف کرتے، گڑگڑاتے جھگڑا کرتے، ایک ایک پیسہ کے لئے مر رہے تھے! مذہب، اخلاقیات، روحانیت، مامتا، زندگی کے قوی سے قوی ترین جذبوں کے چھلکے اُتر گئے تھے اور ننگی بھوک کی پیاسی خونخوار زندگی مُنہ پھاڑے سامنے کھڑی تھی۔

میری بیوی نے کہا "ہم بھی اپنی بچی بیچ دیں؟"

ڈرتے ڈرتے، شرمندہ، مجبور سی ہو کر اُس نے یہ الفاظ کہے اور پھر فوراً ہی چُپ ہو گئی۔ اُس نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ جیسے وُہ اپنے الفاظ کے تازیانوں کا اثر دیکھ رہی ہو۔ اُس کی نگاہوں میں اک ایسا احساسِ جرم تھا جیسے اُس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی بچی کا گلا گھونٹ ڈالا ہو، جیسے اُس نے اپنے خاوند کو ننگا کر کے اُس کے بدن پر کوڑے لگائے ہوں جیسے اُس نے خود اپنے ہاتھوں سے پھانسی کا پھندا تیار کیا ہو اور اب اُس کی دُبلی پتلی گردن اُس میں لٹک رہی ہو۔

مجھے یہ گلہ نہیں کہ وہ کیوں مرگئی۔ مرنے کو تو وہ اُسی وقت مرگئی تھی جس وقت اُس نے یہ الفاظ کہے تھے۔ شاید ان الفاظ کے زبان تک آنے سے بہت عرصہ پہلے ہی وہ مرچکی تھی۔ لیکن اب بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ مرکر بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ غور کرنے پر بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ اُس کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے کیسے، یہ کیونکر ہوا، کس بھیانک قوت نے اُس کی مامتا کو مار دیا تھا۔ اُس کی روح کو کچل دیا تھا۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا۔ مجھے اُس کے مرجانے کا مطلق افسوس نہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ اُس کی مامتا کیوں مرگئی۔ وہ مامتا جسے ہم سب لازوال کہتے ہیں ... مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں نے اُس وقت اپنی بچی کو چھین کر اپنے سینے سے لپٹا لیا تھا .... میں نے خشمگیں نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ اُسی طرح لاتعلقی کے انداز میں، میرے غم و غصّے کو نظر انداز کرتی ہوئی، لنگڑاتی ہوئی، میرے پیچھے پیچھے آرہی تھی۔ کولہو کے اندھے بیل کی طرح اُس کے پریشان بال دھول میں اَٹے ہوئے تھے، جسم پر دھوتی تار تار ہوچکی تھی۔ دائیں پاؤں کے زخم سے خون رستا تھا اور وہ آنکھیں .... ہائے وہ چل پری کہاں غائب ہوگئی تھی۔ وہ سمندر میں طلائی مچھلی کی طرح تیرنے والی سُبک اندام بنگالی دوشیزہ! ... وہ پھول کا سا حُسن جس میں ناچ کا مرز

ایلورا کے مندروں کی رعنائی اور اشوک کے کتبوں کی ابدیت گھلی ہوئی تھی، آج کدھر غائب ہو گیا تھا؟ کس لئے یہ حسن، یہ ممتا، یہ روح اس سڑک پر اک روندی ہوئی لاش کی طرح پڑی تھی۔ اگر یہ سچ ہے کہ عورت ایک اعتقاد ہے۔ ایک معجزہ ہے، زندگی کی سچائی ہے۔ اُس کی منزل، اُس کا مستقبل، تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ اعتقاد، یہ سچائی، یہ معجزہ، چانول کے ایک دانے سے اُگتا ہے اور اُس کے نہ ہونے سے مرجاتا ہے!

جل پری نے میری گود میں دم توڑ دیا۔ وہ تھکی ماندی، خاک میں اَٹی ہوئی اُسی سڑک کے کنارے سو گئی، مری آغوش میں، دو تین ہچکیاں اور سانس غائب۔ . . . . نہ جانے میرے احساسات کیوں مجھے اُس لمحے کی طرف گھسیٹ کر لے گئے۔ جب میں نے پہلی بار اُس کے ہونٹوں کو چوما تھا اور اُس کی دہکی ہوئی سانس نے مجھے سگندھ راج کے پھولوں کی یاد دلا تھی۔ اس وقت بھی وہی سگندھ راج کے پھولوں کی مہک تیزی سے میرے نتھنوں میں گھستی چلی آئی اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں اُس کے مردہ لبوں کی طرف تکنے لگا اور میرے آنسو، اس کے لبوں پر، اس کی آنکھوں پر، اس کے رخساروں پر گرنے لگے۔ وہ میری گود میں مری پڑی تھی۔ جل پری جو انیس سال کی عمر میں مر گئی۔

خاک میں اَٹی ہوئی، ننگی بھوکی پیاسی، جل پری چڑیل بن کر مرگئی۔ مجھے موت سے کوئی شکوہ نہیں، اپنے خدا سے کوئی شکایت نہیں، زندگی سے، ہر سڑک پر گذرتے ہوئے اندھے قافلے سے، کسی سے کوئی شکایت نہ تھی۔ صرف یہی جی چاہتا تھا کہ وُہ اس طرح نہ مرجاتی، میں اک بندے کی طرح نہیں، اک دوست کی طرح اپنے خداؤں سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس میں کیا برائی تھی اگر وُہ زندہ رہتی، اک طبعی عمر بسر کرتی، اُس کا اک چھوٹا سا گھر ہوتا، اُس کے بال بچے ہوتے، وُہ اُن کی پرورش کرتی۔ اُسے اپنے خاوند کی محبت میسّر ہوتی، اک عام اوسط زندگی کی چھوٹی چھوٹی مسرتیں، دُنیا کروڑوں ایسے معمولی چھوٹے آدمیوں سے بھری پڑی ہے جو زندگی سے ان چھوٹی چھوٹی مسرتوں کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے۔ نہ سلطنت، نہ شہرت، نہ فرشتہ پن، پھر بھی اُسے یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں حاصل نہ ہوئیں۔ وُہ کیوں اس طرح مرگئی اور اگر اُسے مرنا تھا تو وُہ ساحل سمندر اور ناریل کے جھنڈ کو دیکھ کر ہی مرتی۔ یہ کیسی موت ہے کہ ہر طرف ویرانی ہے اور لاشیں ہیں اور خلا ہے اور آہ و بکا ہے، سڑک کی خاک ہے اور چپ چاپ چلتے ہوئے قدموں کی چاپ ہے اور دُور کہیں کُتے رو رہے ہیں۔ . . . !

مَیں نے اُسے دفن نہیں کیا، میں نے اُسے جلایا بھی نہیں، میں نے اُسے

وہیں سڑک کے کنارے چھوڑ دیا اور اپنی بچّی کو چھاتی سے چمٹائے آگے بڑھ گیا۔

ابھی کلکتہ دُور تھا اور میری بچی بھُوکی تھی۔ وُہ اب رو بھی نہ سکتی تھی۔ اُس کے گلے سے آواز نہ نکلتی تھی۔ وُہ بار بار اپنا مُنہ ایسے کھولتی جیسے مچھلی جل سے باہر نکل کر پانی کے گھونٹ کے لئے اپنے ہونٹ وا کرتی۔ ہائے یہ ننھی سی جل پری اپنے چھوٹے سے کھلونے کو اپنے سینے سے چمٹائے ایک گھُلتی ہوئی شمع کی طرح میری آنکھوں کے سامنے ختم ہو رہی تھی۔ بجھ رہی تھی اور میں چلا جا رہا تھا۔ میرے اردگرد، آمنے سامنے، آگے پیچھے اور لوگ بھی تھے۔ رواں دواں، مُردوں کا قافلہ ہر اک کی اپنی دُنیا تھی۔ لیکن ہر فرد اُسی موت کی وادی میں سے گزر رہا تھا۔ اور آنکھوں میں، چہروں پر، جسموں پہ اُسی مہیب طاقت کا سایا منڈلا رہا تھا جو اس وادی کی خالق تھی۔ میں ہات جوڑ کر دُعا مانگنے لگا۔ ۔ ۔ ۔ اے خالقِ ارض و سما اس معصوم بچی کی طرف دیکھ۔ ۔ ۔ کیا تیرے دربار میں اس کے لئے دُودھ کی ایک بوند بھی نہیں، اَن داتا ۔ ۔ ۔ دیکھ یہ کس طرح بار بار مُنہ کھولتی ہے بے قرار ہوتی ہے اور تڑپ کر رہ جاتی ہے۔ اے خداوند لایزال، تُو نے خوبصورت موت بنائی ہے۔ لیکن یہ موت تو خوبصورت نہیں، یہ موت تو

معصوم نہیں۔ یہ موت تو اس ننھی سی جان کے لائق نہیں۔ . . . سن بے اے کائنات کی پُر اسرار مخفی قوتِ عظیم . . . اے خداؤں کے ظالم صدرِ اعظم . . . تو اس خوبصورت کلی کو ابھی سے کیوں کچل کر رکھ دینا چاہتا ہے، اس کی تمناؤں کی دُنیا دل کو دیکھ . . . سمندر میں بلبلوں کی افشاں سبک خرام کشتی، اک نغمہ اپنے معراج کو پہنچا ہوا، ناریل کے جھنڈ میں عورت اور مرد کا پہلا بوسہ . . . . کمینے، سفلے، رذیل!

لیکن نہ دعائیں کام آئیں نہ گالیاں اور میری بچی بھی مرگئی، کس طرح تڑپ تڑپ کر اُس نے جان دی، اس کا کرب اور اندوہ میری ان پتھریلی ساکن وجامد، بے نور، بے بصر آنکھوں سے پوچھو۔ وہ دودھ کی اک بوند کے لئے مرگئی۔ وہ بوند جو نہ آسمان سے برسی، نہ زمین نے اُگلی، بے حس آسمان، بے حس زمین اور یہ ظالم سڑک! . . . .

مرنے سے کچھ عرصہ پہلے میری بچی نے اپنا پیارا جھنجھنا مجھے دے دیا۔ دیکھو اب بھی میری مٹھی میں دبا پڑا ہے۔ یہ امانت اُس نے میرے حوالے کی تھی۔ نہیں نہیں، یہ جھنجھنا اس نے مجھے بخش دیا تھا۔ لاپرواہی کے ساتھ، اک ایسے معصومانہ انداز میں اُس نے اُسے میرے حوالے کر دیا تھا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ

اُس نے مجھے بخش دیا، مجھے معاف کر دیا ہے۔ مجھے اپنے لطف و عنایت سے مالا مال کر دیا ہے۔ اُس نے وہ جُھنجھنا میرے ہاتھ میں دے دیا اور پھر میری گود میں مر گئی۔ یہ ایک لکڑی کا جھنجھنا ہے۔ لیکن میرا اعتقاد ہے کہ اگر وہ کلیوپیٹرا ہوتی تو اپنی تخت مجھے بخش دیتی، اگر وکٹوریہ ہوتی تو اپنی سلطنت میرے سپرد کر دیتی۔ اگر ممتاز محل ہوتی تو تاج محل میرے حوالے کر دیتی، لیکن وہ تو ایک غریب ننھی سی لڑکی تھی اور اُس کے پاس صرف یہی ایک لکڑی کا چھوٹا سا جھنجھنا تھا جو اُس نے اپنے غریب نادار اَن داتا کے حوالے کر دیا۔ تم میں سے کون ایسا جوہری ہے جو اس لکڑی کے جھنجھنے کی قیمت کا اندازہ کر سکے۔ بڑے آدمیوں کی قربانیوں پر واہ واہ کرنے والو لے جاؤ اس لکڑی کے جھنجھنے کو، اور انسانیت کے اُس معبد میں رکھ دو جو آج سے ہزاروں سال بعد میری رُوح تمہارے لئے تعمیر کرے گی . . . !!

آخر کلکتہ آ گیا، بھوکی ویران بستی، سنگدل بے رحم شہر، کہیں کوئی ٹھکانا نہیں کہیں روٹی کا لقمہ تک نہیں، سیالدہ سٹیشن، شیام بازار، بڑا بازار، ہریسن روڈ، ذکریا اسٹریٹ، بَو بازار، سوناگاچی، نیو مارکیٹ، بھوانی پور، کہیں چاول کا

ایک دانہ نہیں، کہیں وہ نگاہ نہیں جو انسان کو انسان سمجھتی ہے۔

ہوٹلوں کے باہر بھوکے مرے پڑے ہیں۔ جھوٹی پتلوں میں کتے اور انسان ایک جگہ کھانا ٹٹول رہے ہیں، کتے اور آدمی لڑ رہے ہیں۔ ایک موٹر فراٹے سے گزر جاتی ہے۔

ننگے بدن میں پسلیاں آہنی زنجیریں معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے اندر روح کو کیوں قید کر رکھا ہے۔ اسے اڑ جانے دو۔ اس مہیب زنداں خانے کا دروازہ کھولو

. . . ایک موٹر فراٹے سے گزر جاتی ہے۔

لیکن ہم روح کی فریاد نہیں سنتا . . . مائیں مر رہی ہیں بچے بھیک مانگ رہے ہیں۔ بیوی مر رہی ہے۔ خاوند رکشا والے صاحب کی خوشامد کرتا ہے یہ نوجوان عورت مادرزاد ننگی ہے۔ اسے یہ پتہ نہیں، وہ جوان ہے، وہ عورت ہے، وہ صرف یہ جانتی ہے کہ وہ بھوکی ہے اور یہ کلکتہ ہے . . . بھوک نے حسن کو بھی ختم کر دیا ہے!

میں اس قونصل خانے کی سیڑھیوں پر مر رہا ہوں۔ بیہوش سا پڑا ہوں۔ چند لوگ آتے ہیں، میرے سرہانے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے

گویا مجھے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھ رہے ہیں۔ پھر میرے کانوں میں
اک مدھم سی آواز آتی ہے، جیسے کوئی کہہ رہا ہے :-

"حرامی ہندو ہوگا، جانے دو، آگے بڑھو۔"

وُہ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اندھیرا بڑھ جاتا ہے . . .

پھر چند لوگ رُکتے ہیں۔ کوئی مجھ سے پوچھ رہا ہے۔ . "تم کون ہو؟"

مَیں بمشکل اپنے بھاری پپوٹے اُٹھا کر آنکھیں کھول کر جواب دیتا ہوں

"میں ایک آدمی ہوں، بُھوکا ہوں۔"

وُہ یہ کہتے ہوئے چلے جاتے ہیں "سالا کوئی مسلمان معلوم ہوتا ہے۔"

بھُوک نے مذہب کو بھی ختم کر دیا ہے۔

اب چاروں طرف اندھیرا ہے۔ مکمل تاریکی، روشنی کی ایک کرن نہیں۔

خاموشی گہرا سناٹا!

یکایک کلیساؤں میں، مندروں میں عبادت خانوں میں خوشی کی گھنٹیاں بجنے
لگتی ہیں ساری کائنات شیریں آوازوں سے معمور ہو جاتی ہے۔

ایک اخبار فروش چلا چلا کر کہہ رہا ہے "طہران میں بنی نوع انسان کے
تین بڑے رہنماؤں کا اعلان، اک نئی دُنیا کی تعمیر . . . !"

اِک نئی دُنیا کی تعمیر!!
میری یہ آنکھیں حیرت اور مسرت سے کھُلی کی کھُلی رہ جاتی ہیں۔ احساسات پتھر کی طرح جامد ہو جاتے ہیں۔

میری آنکھیں اُس وقت سے کھُلی کی کھُلی ہیں۔
میں سیاستدان نہیں ہوں۔ ستار بجانے والا ہوں۔ حاکم نہیں ہوں۔ حکم بجا لانے والا ہوں لیکن شاید ایک نادار مغنّی کو بھی یہ پوچھنے کا حق ہے کہ اس نئی دُنیا کی تعمیر میں کیا اُن کروڑوں بھوکے ننگے آدمیوں کا بھی ہاتھ ہوگا۔ جو اس دُنیا میں بستے ہیں میں یہ سوال اس لئے پوچھتا ہوں کہ میں بھی اِن تین بڑے رہنماؤں کی نئی دُنیا میں رہنا چاہتا ہوں، مجھے بھی تسلطائیت، جنگ اور ظلم سے نفرت ہے۔۔۔ اور گو میں سیاستدان نہیں ہوں۔ لیکن مغنّی ہو کر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اُداس نغمے سے اُداسی ہی پیدا ہوتی ہے، جو نغمہ خود اُداس ہے۔ وُہ دوسروں کو بھی اُداس کر دیتا ہے۔ جو آدمی خود غلام ہے، دوسروں کو بھی غلام بنا دیتا ہے۔ دُنیا کا ہر چھٹا آدمی ہندوستانی ہے، یہ غیر ممکن ہے کہ باقی پانچ آدمی کرب کی اُس زنجیر کو محسوس نہ کرتے ہوں جو اُن کی روحوں کو چیر کر نکل رہی ہے اور ایک ہندوستانی کو دوسرے ہندوستانی سے

ملا دیتی ہے، جب تلک میری ستار کا ایک تار بھی بے آہنگ ہوتا ہے۔ اُس وقت تک سارا نغمہ بے آہنگ و بے ربط رہتا ہے۔ میں سوچتا ہوں یہی حال انسانی سماج کا بھی ہے۔ جب تک دُنیا میں ایک شخص بھی بھوکا ہے۔ یہ دُنیا بھوکی رہے گی، جب تک دُنیا میں ایک آدمی بھی غلام ہے۔ سب غلام رہیں گے۔ جب تک دُنیا میں ایک آدمی بھی مفلس ہے سب مفلس رہیں گے ......!

اسی لئے مَیں تم سے یہ سوال پوچھ رہا ہوں

تم مجھے مُردہ نہ سمجھو۔ مُردہ تم ہو۔ مَیں زندہ ہوں اور اپنی پھٹی پھٹی بے نور بے بصر آنکھوں سے ہمیشہ تم سے یہی سوال کیا کروں گا۔ تمہاری راتوں کی نیند حرام کر دونگا تمہارا اُٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، چلنا پھرنا سب دُوبھر ہو جائے گا۔ تمہیں میرے سوال کا جواب دینا ہوگا۔ میں اُس وقت تک نہیں مر سکتا جب تک تم میرے سوال کا تسلی بخش جواب نہ دو گے

مَیں یہ سوال اس لئے نہیں پوچھ رہا ہوں کہ مَیں تمہاری نئی دُنیا میں رہنا چاہتا ہوں۔

مَیں یہ سوال اس لئے بھی پوچھ رہا ہوں کیونکہ میں نے جل پری کو بے گور و کفن سڑک پر چھوڑ دیا ہے اور میرے ہات میں لکڑی کا ایک جھنجھنا ہے ......!

موبی

موبی اوہیو کا رہنے والا تھا اور فوج میں بھرتی ہونے سے پہلے نیویارک میں وکالت کرتا تھا۔ موبی کے بال گھنے اور گہرے سنہری تھے اور یہی سونا اُس کے رخساروں پر تھا۔ ایسا سونا جو ماہِ ستمبر میں سیب کی جلد پر رخشاں نظر آتا ہے۔ موبی کا قد چھ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا تھا۔ اُس کا قہقہہ بے جھجک اور بچپن کی طرح معصوم تھا۔ دو نتھنوں کے درمیان ناک کی کرتی پر ایک چھوٹا سا تِل تھا اس چھوٹے سے سیاہ نقطے نے موبی کے چہرے کو شباب کی تمام تر شوخیوں کے باوجود بھولا اور معصوم سا بنا دیا تھا اور وُہ اُس بچے کی طرح دکھائی دیتا جس نے اپنی ناک کو قلم کی نوک سے میلا کر لیا ہو۔ اسی لئے تو پرویز اُسے "غلیظ موبی"

کہا کرتا تھا۔ اس پر موبی اور پرویز میں اچھی خاصی چخ رہتی جو اکثر شریفانہ ہاتھا پائی تک بڑھ جاتی . . . . . !

پرویز اور شام کی ملاقات موبی سے اُن کے سٹوڈیو میں ہوتی تھی۔ موبی آسام اور بنگال سے لوٹ کر یہاں چند ماہ کے لئے آیا تھا۔ شروع دسمبر کے دنوں میں وُہ اکثر چھاؤنی کی سڑکوں پر اکیلا گھومتا ہوا نظر آتا۔ لیکن اب اُسے چھاؤنی کی سڑکوں پر سائیکل کی سواری کرنے، سیٹی بجانے اور اکیلے گھومنے سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ چھاؤنی کے طبقہ اناث کے کاروباری افراد بھی اُسے پسند نہ آتے تھے۔ اور سینما میں بھی بالعموم ہالی وڈ کی وہی تصویریں دکھائی جاتیں جن میں ننگی ٹانگوں کی نمائش زیادہ ہوتی، کیا سینما کے منتظم فوجیوں کو اس قدر کور ذوق سمجھتے ہیں۔ کہ عورتوں کے گرم گوشت کے علاوہ اُنہیں اور کسی چیز کی طلب نہیں۔ یہ سوچکر اُسے اکثر اس قدر غصہ آتا تھا کہ وُہ ہفتوں کسی سینما گھر کے قریب نہ پھٹکتا . . .
یہ بات نہ تھی کہ اُسے سینما سے نفرت تھی۔ لیکن وُہ تو ہالی وُڈ کی اُن مخصوص تصویروں کو دیکھنا چاہتا تھا جو سماجی طنز کی حامل ہوتیں۔ لیکن ایسی تصویریں یہاں شاذونادر ہی دیکھنے میں آتی تھیں۔ ورنہ ہر بار وہی ننگی ٹانگیں، تھرکتے ہوئے کولہے کھلی ہوئی تیتیی، پستانوں کے کبوتر مائل پرواز اور جیٹر بگ کا ناچ، یا اللہ اس جیٹر بگ سے

کب خلاصی ہو گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اسی لئے تو وہ اکثر سائیکل لئے سڑکوں پہ اکیلا "چکر" کاٹتا نظر آتا۔ سٹوڈیو کے سامنے سے وہ کتنی بار گزر چکا تھا لیکن سٹوڈیو کے اندر جانے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی اُس نے اس خواہش کو ہر بار اپنے دل میں دبا دیا تھا۔ پھر بھی یہ خواہش بار بار اُبھر آتی تھی۔ قبر جتنی گہری ہو۔ خواہش اُسی قدر بے چین ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ نجانے گورمیں مُردوں کا کیا حال ہوتا ہو گا ۔ ۔ ۔ ہاں کرسمس کے دن تو خود موبی کی حالت مُردوں سے بدتر تھی۔ اس قدر پریشان، آوارہ، کھویا کھویا سا وہ محسوس کر رہا تھا۔ دو بار وہ سٹوڈیو کے سامنے سے گزرا اور اک نگاہ ڈال کر گزر گیا تیسری بار جب وہ پھر گھوم کر لوٹا تو اُس نے سوچا کیا ہرج ہے۔ ہندوستانی اک ناقابلِ اعتبار مخلوق سہی، جاہل، غلام، کالے، "نکمے"، احساسِ کمتری کے شکار سہی لیکن پھر بھی یہ لوگ فلمیں بناتے ہیں۔ یہ فلمیں تکنیک کے اعتبار سے ناقص ہوں گی۔ لیکن جہاں تک فلمی صنعت اور فلموں کی تعداد کا تعلق ہے۔ اس وقت ہالی وڈ کے بعد ہندوستانی فلمی صنعت کا ہی نام آتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ آخر ایسا کیا بُرا ہے! ۔ ۔ ۔ پھر اُس نے سوچا نہیں ان لوگوں سے ملنا ٹھیک نہیں۔ اس نے سُن رکھا تھا کہ یہ لوگ بڑے بددیانت اور محسن کش ہوتے ہیں، قطعی ناقابلِ اعتبا

اور —— غریب کس قدر رہی بھی! یعنی ہمارے ہاں کی بلّیاں یہاں کی عورتوں سے زیادہ فربہ دکھائی دیتی ہیں ..... اور کچھ بھی ہو، انسانی مساوات کا فلسفہ درست سہی، لیکن اس کالے رنگ میں احساسِ نفرت کو زندہ کر دینے کی قوت ضرور موجود ہے۔ پھر یکایک موبی کو کیمو کا خط یاد آیا۔ موبی اور کیمو دونوں مل کر ایک ایسا شیشہ بنانے کی سعی کر رہے تھے کہ جسے پروجیکٹر پر چڑھانے سے سیاہ اور سپید فلمی تصویر خود بخود قدرتی رنگوں میں جلوہ گر نظر آتے۔ کیمو کا یہودی ذہن دماغ اس مشکل کو حل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا اور اب وہ موبی کے سرمائے سے اس ایجاد کو پیٹنٹ کرا رہا تھا۔ کیمو نے لکھا تھا کہ موبی ہندوستانی سٹوڈیو، اور سینما گھروں کے مالکان سے بھی اس ایجاد کی کھپت کے بارے میں بات چیت کرے، کیا حرج ہے؟ اگر موبی ہندوستانی بھنگی، باورچی، بیرے، بساطی سے بات کر سکتا تھا۔ تو ان ہندوستانیوں سے کیوں نہیں جو تصویریں بناتے تھے۔ وُہ تیزی سے سائیکل گھما کر سٹوڈیو کے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے پر اُسے رُکنا پڑا، کیونکہ پٹھان چوکیدار راہ روکے کھڑا تھا، چوکیدار نے اُسے سٹوڈیو کا اجازت نامہ دکھائے بغیر اندر جانے سے روک دیا۔ موبی کے پاس اجازت نامہ کہاں سے آتا؟ لیکن ہندوستانی

چوکیدار کی یہ ہمت؟ اس نے سائیکل آگے بڑھا کر کہا۔ مجھے جانے دو میں سٹوڈیو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے لہجے میں تحکم تھا، تفخر اور غرور، لیکن چوکیدار پھر بھی مرعوب نہ ہوا اور بات بڑھ گئی۔ راہ گیر اکٹھے ہو گئے۔ پرویز نے جب ایک امریکی فوجی کو لوگوں میں گھرے دیکھا۔ وہ اس وقت پورچ میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ تو وہاں سے آہستہ آہستہ سٹوڈیو کے دروازے تک گیا کہ دیکھے تماشہ کیا ہے؟

"کیا بات ہے لالہ؟" اس نے چوکیدار سے پوچھا

چوکیدار جس کا چہرہ اس وقت ایک قندھاری انار کی طرح سرخ نظر آ رہا تھا بلند آواز میں بولا "صاب اندر آتا ہے۔ ام بولتا ہے۔ تمارا کاغذ کدھر؟ صاب کے پاس کاغذ نہیں اے تو ام کیسے جانے دے گا؟"

موبی نے پرویز سے کہا۔ "یہ چوکیدار بڑا بدتمیز ہے۔"

پرویز نے کہا "آزاد ملک کا رہنے والا ہے نا! ابھی غلامی نہیں سیکھی!"

پرویز نے پٹھان کو اجازت نامہ لکھ کر دیا اور موبی کو اندر آنے کو کہا۔

پٹھان پرچہ لے کر بڑبڑایا "او خو ہم قندھاری پٹھان ہے۔ ام کسی سے نہیں ڈرتا اے۔ ام کابل سے آیا اے۔ خو ام اپنے ملک میں صاب لوگ تو کیا صاب لوگ کی ریل گاڑی کو بھی گھسنے نہیں دیتا اے۔ او خو ریل گاڑی آئیگا تو

صاب لوگ بھی آئے گا خو تم ہندوستھانی بڑا بے وقوپ اے"!

"کیا کہہ رہا ہے یہ خبیث؟" موبی نے پوچھا

پرویز نے بتایا تو وہ ہنسنے لگا۔ بولا "اچھا ہوا میں نے اپنا ہات روک لیا ورنہ میں اُسے ایک چانٹا تو ضرور لگا دیتا۔ گو مجھ سے کہا گیا ہے کہ کبھی کسی صورت میں .... کسی ہندوستانی کو چانٹا نہ مارا جائے"!

پرویز نے کہا "ہاں اچھا ہوا۔ کیونکہ وہ ہندوستانی نہیں، افغان ہے"

"افغان"؟ موبی نے معصومیت سے پوچھا "دونوں میں کیا فرق ہے"؟

پرویز نے کہا "وہ ہندوستانی ہوتا تو چانٹا کھانے کے بعد دن بھر تمہاری جوتیاں سیدھی کرتا اور شام کو تمہیں سلام کر کے تم سے بخشش کا طالب ہوتا مگر یہ چوکیدار تو افغانی ہے اور ایک افغانی اور ہندوستانی میں یہی فرق ہے کہ افغان کے پاس چھری ہوتی ہے اور ہندوستانی کے پاس سلام"!

موبی مسکرایا "میں تم سے سیاست پر گفتگو نہیں کرنا چاہتا ... مگر یہ تو بتاؤ تم نے اپنے سٹوڈیو کی حفاظت کے لئے ایک افغانی کو کیوں مقرر کر رکھا ہے"؟

پرویز نے کہا "ہماری قوم کا دستور یہی ہے۔ ہم اپنے ملک کی حفاظت

کے لیے انگریزوں کو رکھتے ہیں اور اپنے سٹوڈیو کے لیے افغانیوں کو۔"

"تو کیا تم اپنے سٹوڈیو کی خود حفاظت نہیں کر سکتے ؟"

پرویز نے تلخی سے کہا۔" اگر ایسا کر سکتے تو تمہیں سمندر پار سے یہاں آنے کی دعوت دیتے ؟"

موبی نے معذرت پیش کرتے ہوئے کہا۔" میں امریکی سپاہی ہوں ۔ ۔ ۔ میرا نام موبی ہے ۔ ۔ ۔ میں تمہارا سٹوڈیو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

پرویز نے فخر کرتے ہوئے کہا۔" مزاج کیسا ہے۔ میرا نام پرویز ہے ۔ ۔ ۔ سٹوڈیو ؟ مگر آج تعطیل ہے۔ سٹوڈیو کے مالک یہاں نہیں ہیں اور پھر —— آج تو کرسمس ہے تم سٹوڈیو کیوں دیکھنا چاہتے ہو۔ آج تو کسی ناچ گھر میں کسی نازک کمر یا ۔ ۔ ۔ ۔ !

موبی نے سنجیدہ رو ہو کر کہا۔" مجھے ناچ پسند نہیں !"

پرویز نے اُسے حیران نگاہوں سے دیکھا۔ پھر کہنے لگا۔" آؤ تمہیں اپنے دوستوں سے ملاؤں ۔"

برآمدے میں بہت سے لوگ بید کی کرسیوں پر بیٹھے برج کھیل رہے تھے پرویز نے تعارف کرایا۔" یہ ممتاز ہیں، یہ عذرا بہن، یہ حمید یہ پرکاش، یہ نظام ۔ ۔ ۔ ۔ ہم لوگ اس وقت سٹوڈیو کی فارگو کے انتظار میں بیٹھے ہیں تصویر

دیکھنے جا رہے ہیں"۔

"کونسی تصویر؟"

"کوئی سی بھی۔ . . . ہندوستانی تصویر دیکھیں گے۔ تم بھی چلو گے نا! ضرور"

موبی قدرے توقف کے بعد بولا "ہاں . . . میں نے آج تک کوئی بھی ہندوستانی تصویر نہیں دیکھی، دیکھنا چاہتا ہوں"۔

"تو چلو!"

فارگو آئی تو وہ اس میں بیٹھ کر چلے گئے۔ سینما پہنچے تو ٹکٹ لے کر اندر بیٹھے۔ اندر بیٹھے تو مونگ پھلی، تلے ہوئے آلو، دال، چیوڑا، اور کباب کھانے لگے۔ کباب کھا چکے تو پان آ گئے۔ موبی ہر بار اپنی جیب سے پیسے نکالتا، لیکن وہ لوگ اُسے ٹال دیتے۔ "گھبراؤ نہیں، ہم جانتے ہیں کہ امریکی سپاہی بہت امیر ہوتے ہیں، ہم بھی کسی روز تمہاری کھال اُتار لیں گے۔ مگر آج نہیں۔ آج تو کرسمس ہے!"

تصویر دیکھی گئی، سب نے موبی سے پوچھا۔ موبی نے بھی مروت میں تعریف کر دی اچھی تھی۔ مگر گانے بہت زیادہ تھے۔ "غالباً میوزیکل ہو گی؟" اُس نے پوچھا

"یہاں ہر پکچر میوزیکل ہوتی ہے مسٹر" شام گر جا "سمجھے مسٹر موبی؟"

اُس نے سیگرٹ کا کش زور زور سے کھینچتے ہوئے موبی کو گھورا

"مسٹر کیوں نہیں؟ مشٹر کیوں!" موبی نے پوچھا

"بس میں تو اُسے اسی طرح کہتا ہوں، جس سے مجھے محبت ہو جاتی ہے، سمجھے بھُوتنی کے!"

"بھُوتنی کیا؟ . . . کیا مطلب؟" موبی نے حیرت سے پُوچھا

"مطلب وطلب ہم نہیں جانتے، بس یہ پیار کی باتیں ہیں۔ سمجھے موبی دُو بی چُوچی مُوچی" شام نے موبی کے سنہری بالوں کو سہلا دیا

موبی نے خوش ہو کر کہا "اچھا اب میں تمہیں شام کی بجائے شیمی کہا کرونگا"

"شیم اشیم!" حمید نے کہا

"پھٹے مُنہ!" شام کے مُنہ سے بے اختیار نکلا

"فِٹے مو" کیا؟

حمید نے کہا "یہ بھی ایک گالی ہے۔ یہ سالا پنجابڑا ہے اور گالی کے سوا اور کچھ نہیں آتا اسے، خوشی ٹیک خوشی نہ ٹیک"

"ہاں ٹھیک کہتا ہے یہ پوربیا!" شام نے موبی کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا "مگر کچھ، تو آج تمہیں کسی چینی رستوران میں لے جا کر کرسمس کا جشن منوا دیں

جلدی بولو!"

"فِتّے مُو! موبی نے اپنی ٹوپی ہوا میں اُچھال کر کہا۔" بس آج سے اپنے کرنل کو میں کہا کروں گا۔ او بوائے او بوائے . . . !!!"

ننگ کنگ رستوران میں برقی قندیلوں کے فانوس کے نیچے کھانے کی میز تھی اور سامنے دیوار پر چیانگ کے شک، چرچل اور روزویلٹ کی تصاویر تھیں چیانگ کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ لیکن چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا روزویلٹ ایک نو دولتیے ملک کے حکمران کی طرح آسودہ اور مطمئن نظر آتا تھا۔ چرچل کے لب بھنچے ہوئے تھے اور اس نے سگار کو سختی سے دبا رکھا تھا۔ اُس کے لبوں کی سختی اور اُس کی آنکھوں کی ارادیت کہہ رہی تھی۔ ہم مالک ہیں اور مالک رہیں گے۔ پرکاش کو چرچل اور نگلے منشو مرحوم کے چہرے میں یکایک اک مماثلت سی نظر آنے لگی۔ خدوخال اور بناوٹ الگ ہونے کے باوجود ان دونوں چہروں کی روح ایک تھی۔ وہی منتقمانہ جذبہ، وہی جیتنے کا سا عزم اور نگلے منشو کو بھی تو فرانسیسی "چیتا" ہی کہتے تھے . . . پرکاش بار بار ان

تصاویر کو دیکھ کر رُک جاتا تھا۔ یکایک اُسے احساس ہوا کہ اُس کی آنکھیں دیوار پر کسی اور کو بھی دیکھنا چاہتی ہیں۔ لیکن کس کو؟...... آج کرسمس ہے۔ اور اتحادیوں کے جھنڈے دیواروں پر اور آر پار بندھن واروں کی طرح سجے ہوئے تھے۔ پرکاش کی نظر بار بار کسی اور جھنڈے کو بھی ڈھونڈھتی رہیں، لیکن کس کو...... وُہ تصویر جو ابھی بنی نہ تھی۔ وُہ جھنڈا جو ابھی ناپید تھا... پرکاش نے سوچا، یہ —— اُس کے دل کی اُداسی کیوں بڑھتی جا رہی ہے، کیوں اُسے ان بچارے شریف چینی ویٹروں اور خوبصورت امریکی اور کینیڈین ہوابازوں کے چہروں پر غرور اور تحکم کے آثار نظر آتے ہیں۔ وُہ چینی جو ہاتھ میں ایک پنسل اور کاغذ لیئے آرڈر کے لئے .... مؤدب کھڑا تھا۔ پرکاش کو اُس کے کھڑے ہونے کے انداز میں بھی اک عجیب اندازِ تفاخر کی جھلک نظر آتی تھی۔ کیا یہ نظر کا دھوکا تھا؟ یا اس کے ذہن کی عصبیت؟

شام بھی خاموش تھا۔ پوری مجلس پر خاموشی طاری تھی۔ نامعلوم کیوں؟ موبی نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے کہا، "مجھے اس رستوران کے تلے ہوئے پران بہت پسند ہیں۔ تمہیں پسند ہیں شمی؟"

شام چونک پڑا۔ "بہت۔" اُس نے آہستہ سے کہا اور ایک پران اُٹھا کر اپنے

مُنہ میں ڈال لیا۔ پھر اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لیکن اُن کی میز کے علاوہ اور کسی میز پر ہندوستانی موجود نہ تھے۔ یہاں اپنے ہم وطن بہت کم ہیں۔ اُس نے سوچا۔ پھر یکایک اُسے خیال آیا۔ ہندوستانی یہاں کہاں؟ وہ تو بنگال میں، اوڑیسہ میں، اندھرا میں، مدراس میں، بہار میں بھوکا مر رہا ہے۔ جاہل! ——— اُس کا حلق رُکنے لگا!

پرکاش نے گفتگو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "چینی چاپ سوئی میں وہ لطافت نہیں ہوتی جو امریکی چاپ سوئی میں ہوتی ہے۔"

حمید نے کہا "ہاں ——— اور غذائیت بھی کم ہوتی ہے!"

نمناز نے کہا "مجھے بھی امریکی چاپ سوئی بہت پسند ہے۔"

"شکریہ" موبی نے خوش ہو کر کہا "میں اسے اپنی کرسمس کا بہترین ٹوسٹ سمجھوں گا۔"

دو کینیڈین ہوا باز قریب سے گزرتے گزرتے رُک گئے۔ موبی نے نگاہ اُٹھا کر اُن کی طرف دیکھا اور جھٹ اُٹھ کر ان کی طرف بڑھا۔

"یہ جان ہے، یہ ٹام ہے۔ یہ دونوں مونٹریال سے آئے ہیں۔" موبی نے اپنے ہندوستانی دوستوں سے اُن کا تعارف کرایا۔ رسمی تعارف کے بعد وہ

دونوں اسی میز پر بیٹھ گئے "مگر ہم کچھ کھائیں گے نہیں"۔ ٹام نے کہا "ہم نے ابھی ابھی . . . . ."

پھر چند لمحے خاموشی رہی۔ چینی سازوں کا مدھم سریلا نغمہ ریکارڈ سے نکل رہا تھا۔

موبی نے کہا "۔ . . جان . . . یہ کرسمس . . . وطن سے کتنی دور آئی ہے"

جان خاموش رہا۔

ٹام نے کہا "صنوبروں پر برف دیکھنے کو جی چاہتا ہے . . . پر باہر نظر دوڑاتا ہوں تو آسمان پر پھیکے پھیکے ستارے نظر آتے ہیں!"

جان نے کہا "بیرا ایک گلاس پانی کا لاؤ!"

موبی نے کہا "تمہارے چھوٹے چھوٹے بھائی بہن تمہارے ماں باپ کا دل بہلانے کو موجود ہوں گے۔ لیکن میری ماں کے پاس والد کے مرجانے کے بعد میرے سوا اور کون ہے؟ . . . شروع ہی سے جان ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب رہے ہیں۔ کبھی کبھی ماں کی یاد تو مجھے بزدل بنا دیتی ہے"۔

ٹام نے کہا "اس وقت گھر میں مومی شمعیں ہوں گی . . . کرسمس کا پیڑ اور باہر گلی میں اکارڈین کا نغمہ، ہائے بس ایک دفعہ تو اسے سننے کو جی چاہتا ہے"۔

موبی نے کہا "میں تو ان دوستوں کا شکر گذار ہوں، جنہوں نے آج کے دن . . . !" وہ چپ ہو گیا۔

جان نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "پرویز صاحب آپ کیا تنخواہ لیتے ہیں"۔

"بس"۔ جان پرویز کا جواب سُن کر بہت حیران ہوا۔ "ہمارے ہاں اتنی تنخواہ تو ایک کان کن لیتا ہے۔ آٹھ سو روپے"۔

حمید نے کہا "یہاں یہ تنخواہ بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان کی آمدنی فی کس چھ پیسے یومیہ ہے"۔

"ہاں، یہ بے حد غریب ملک ہے"۔ مونٹریال کے ہوا باز جان نے لاپرواہی سے کہا "موبی، واپس کیمپ چلو گے"؟

"ابھی نہیں، تم جاؤ، میں ذرا ٹھہر کر . . . "

دونوں کینیڈین ہوا باز "گڈ نائٹ" کہکر رخصت ہوئے۔ اس کے بعد موبی بل ادا کرنے پر بڑی دیر تک مصر رہا۔ آخر جب شام نے اُسے گالی دی۔ تب جا کر وہ چپ ہوا۔ بل ادا کر کے رستوران سے باہر نکلے تو پرویز۔ پرکاش، حمید عذرا بہن اور ممتاز نے بھی رخصت چاہی۔

سُو لانگ!

سُو لانگ!

شام اور موبی اکیلے رہ گئے۔ وُہ دونوں اب اُس سڑک پر سے گذر رہے تھے۔ جہاں انگریزی سینما گھروں کی عمارتیں تھیں۔ ہوا میں شراب تھی، کپڑوں میں عطر تھا۔ لبوں پر مغربی نغمے، نوشیرواں اینڈ نوشیرواں اینڈ سنز شراب فروش کی دُکان کے وسیع احاطے میں ایک لاؤڈ سپیکر لگا ہوا تھا اور ایک فوجی اپنے ساتھیوں کو مسیح پر ایمان لانے کی تلقین کر رہا تھا۔

"ہم گناہگار ہیں۔ ہم سب گناہگار ہیں، آؤ، مسیح کے قدموں میں جھک جاؤ۔"

سُننے والوں میں امریکن، کینیڈین، آسٹریلین اور انگریزی سپاہی تھے۔ جو چوراہے میں سے گذرتے گزرتے رُک جاتے تھے اور چند منٹ رُک کر پھر چلے جاتے تھے۔ تین چار ہندوستانی بیرے بڑے غور سے اس لیکچر کو سُن رہے تھے اور پھر ملاسی زبان میں اس پر تنقید بھی کرتے جاتے تھے۔ ایک گداگر، ایک کوڑھی اور ایک خدمتگار جس کے پاس دو جنادری قسم کے کتّے زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے، بڑے غور سے سُن رہے تھے۔

"مسیح کے قدموں میں جھک جاؤ ہم سب مسیح کی بھیڑیں ہیں۔"

"بھیڑیں! یا بھیڑیئے؟" شام نے پوچھا

موبی نے کہا "غالباً تمہارا اشارہ جنگ کی طرف ہے۔ مجھے جنگ کی شقاوت سے انکار نہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انسانی ترقی کے آدرش کے لئے خون بہانا جائز ہے!"

"کس کا آدرش!" شام نے پوچھا "ایک آدرش امیر کا ہوتا ہے۔ ایک آدرش غریب کا ہوتا ہے۔ ایک آدرش سفید آدمی کا ہوتا ہے۔ ایک آدرش کالے آدمی کا ہوتا ہے۔ دونوں انسانی ترقی کے لئے سوچتے ہیں۔ لیکن الگ الگ — ان دونوں کے سپنے جدا جدا ہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ جنگ نہیں دو سپنوں کی لڑائی ہے!"

"تم سچ کہتے ہو" موبی نے جواب دیا "لیکن یہ کالے اور گورے آدمیوں کے سپنوں کی لڑائی نہیں۔ ہم تو اس سپنے کے خلاف لڑ رہے ہیں جو فسطائیت کے اجارہ دار دیکھ رہے ہیں۔ وہ سپنا جو ٹوجو دیکھتا ہے جو ہٹلر دیکھتا ہے، ایک کالا ہے، ایک گورا۔ تمہاری دلیل غلط ہے۔

میں جانتا ہوں یہ سپنے بہت بھیانک ہیں۔ مجھے ان سے نفرت بھی ہے

لیکن اس کا کیا ثبوت کہ تم بھی وہی سپنا نہیں دیکھ رہے ہو؟"

"اس کی گواہ ہماری امریکی تاریخ ہے۔" موبی نے فخریہ لہجے میں کہا "انگریزوں کی جمہوریت پسندی ہے۔ روس کا اشتراکی نظام ہے۔ چین کی کومن تانگ ہے جسے سنایات سن ایسے آزادی پسند نے ترتیب دیا ہے ہمارا ضمیر بالکل صاف ہے۔"

"اور ہندوستان"۔ شام نے چڑ کر کہا: غالباً تمہارا ضمیر بھی جنگی مصلحتوں کے پیش نظر آہن اور کنکریٹ کا بنا ہوا ہے کہ اس پر کسی اخلاقی سبب کا اثر نہیں ہوتا"

موبی نے کہا:" میں اس ملک میں تمہارا مہمان ہوں۔ تمہاری حکومت کا مہمان ہوں، مجھے اس ملک کے حالات کے بارے میں زیادہ آگاہی نہیں ہے اور پھر میں یہاں کی پیچیدہ سیاست کی گتھیوں کو سلجھا بھی نہیں سکتا۔ اتنا جانتا ہوں کہ جب میں پچھلے دنوں بنگال میں تھا اور ہزاروں آدمیوں کو قحط سے مرتے دیکھ رہا تھا۔ تو میں یہی سوچ سوچ کر حیران ہوتا تھا کہ یہ کیسے لوگ ہیں۔ اپنے سامنے اپنے ہمسایوں کو اپنے عزیزوں کو مرتے دیکھتے ہیں اور اُن کی کوئی مدد نہیں کرتے۔ اُن کے لئے اُن کے ہاتھ میں چاول کا ایک دانہ نہیں آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہیں۔ سچ کہتا ہوں۔ میں نے ایسے پتھر دل لوگ

کہیں نہیں دیکھے۔ کیا یہ قومیت کا فقدان تو نہیں؟ . . . . مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے شیمی! جیسے یہ ایک ملک نہیں کئی ملک ہیں۔ ایک قوم نہیں، کئی قومیں ہیں ایک زبان نہیں، کئی زبانیں ہیں۔ ایک کلچر نہیں کئی کلچر ہیں۔ ہر ایک دوسرے سے الگ ہے اور اپنی جگہ منفرد!"

شام نے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے؟ بنگال کی مدد کس نے کی؟ کیا یہ چند لاکھ روپے، یا اناج کی چند بوریاں جو سرکاری یا غیر سرکاری طور پر پبلک کے ایما پر یا حکومت کے نام پر بنگال میں صرف کی گئیں۔ بنگال کی بھوک کو مٹا دینے کے لئے کافی تھیں، یہ مدد تو آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ بنگال کو خود بنگال نے بچایا ہے۔ ورنہ آج تمہیں ایک بنگالی بھی زندہ نظر نہ آتا۔ قحط کی شدت کا وہ عالم تھا . . . . لیکن آخر امداد کی بھی ایک حد ہوتی ہے جو آدمی خود موت کے بھنور میں پھنسا ہو وہ دوسروں کی مدد کیا کرے گا۔ تمہارے گھروں میں خوش حالی ہے۔ فارغ البالی ہے۔ اجناس کی کثرت ہے۔ تم لوگ ترس کھا کر اپنے ہمسایوں کی مدد کر سکتے ہو۔ ان کی مصیبت پر آنسو بھی بہا سکتے ہو۔ لیکن جس غریب کے پاس خود کھانے کو کچھ نہ ہو۔ وہ اپنے ہمسائے کی کیسے مدد کرے گا؟ . . .

اور آنسو؟ اس منزل پر پہنچ کر آنسو بھی جواب دے جاتے ہیں۔ آخر آنسو بھی

تو روٹی سے پیدا ہوتے ہیں اور جب روٹی ہی نہ ملے تو آدمی کیا دوسروں کی فاقہ مستی پر آنسو بہائیگا؟ . . . ہم ایک قوم نہ سہی، بہت سی قومیں سہی، . . . لیکن یورپ میں بھی تو بہت سی قومیں ہیں۔ NRRA اُن کی مدد کیلئے تیار ہے۔ ہمارے لئے کیوں نہیں؟ بلقانی قومیں اور خصوصاً یونان قحط کی کس منزل سے گزر رہا ہے۔ وہاں اتحادیوں نے کس مشکل سے گندم کی بوریاں پہنچائی ہیں ——— اور یہاں ہم مانگتے ہیں گندم کی بوریاں اور ملتی ہیں وسکی کی بوتلیں!"

موبی نے ہنس کر کہا "بس میں اپنے کانوں سے سُن رہا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"سب سُن رہا ہوں۔ دماغ میں جگہ دے رہا ہوں۔ لیکن کچھ کہوں گا نہیں"

"کیوں؟"

"ہمیں ہدایات ہیں۔ سب کچھ سُن لو۔ مگر مُنہ سے کچھ نہ بولو۔ خاص طور پر اس مسئلے پر ——— سُنو، مجھے ایک اور دلچسپ بات اس وقت یاد آئی، مجھ سے کہا گیا ہے کہ ہندوستانیوں سے تحفے تحائف نہ قبول کرو اور اگر قبول کرو تو ایسے تحائف جو بہت ہی کم قیمت کے ہوں۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ میں نے سُنا ہے کہ ہندوستانیوں کا یہ دستور ہے کہ اک حقیر سا تحفہ دے کر بہت بڑا انعام حاصل کرنے کی توقع کرتے ہیں۔"

شام کی تلخی بڑھتی جا رہی تھی۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔ "یہ سچ ہے! مگر — کاش یہ ہدایات آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کو دی جاتیں۔ ہم تو اپنے تحفوں میں اپنا گھر بھی لُٹا بیٹھے۔ اس سے ہمیں جو فائدہ پہنچا، وُہ ساری دنیا جانتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستان نے کبھی کسی کو نہیں لُوٹا۔ وُہ ہمیشہ خود لُٹتا رہا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستان میں ہمیشہ لوٹنے والے آتے رہے۔ ہندوستانیوں نے کبھی باہر جا کر کسی ملک یا قوم کو نہیں لوٹا ہے! . . . . اور آج ہم پر یہ تہمت لگائی جاتی ہے اُس تہذیب کے وارثین کی طرف سے جنہوں نے ریڈ انڈین لوگوں سے اُن کا سارا ملک ہتیا لیا تھا۔ خُدا جانے اُس وقت یہ ہدایات کیوں نہ دی گئیں۔

موبی نے کھسیانہ ہو کر کہا۔ "آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

"وُہ سب کچھ جو تم غلام یورپ کے لئے تجویز کرتے ہو۔ آزادی اور

روٹی۔ بلکہ ہمارے لئے صرف آزادی۔ پھر روٹی ہم خود پیدا کریں گے"۔

موبی نے کہا۔ "آزادی دی نہیں جاتی، حاصل کی جاتی ہے"۔

"تو غلام یورپ کو بھی کیوں نہ اُس کی قسمت پر چھوڑ دو۔ اسے خود اپنے درد کا مداوا کرنے دو"۔

"یہ تمہارا اپنا اندرونی مسئلہ ہے۔ ہم اس میں کیسے دخل دے سکتے ہیں"۔

"یہی سلوک یورپی قوموں کے ساتھ روا رکھو۔ جب تمہاری منطقی حیثیت مستحکم ہوگی۔ لیکن اخلاقی اعتبار سے وُہ بھی بے حد ناقص ہوگی۔ کیونکہ انسانی سماج کا ایک جسم ہے۔ اگر ٹانگ پر زخم آجائے تو دماغ مدد کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ شاید ابھی تم اس حقیقت کو نہیں سمجھتے ہو۔ آٹھ دس جنگوں کے بعد سمجھو گے کہ امن اور جنگ کی طرح انسانی آزادی بھی ناقابلِ تقسیم ہے۔ وُہ کل بنی نوعِ آدم کی میراث ہے۔ جب تک وُہ سارے انسانوں میں مشترک نہیں ہوتی۔ ہم تو خیر غلام رہیں گے ہی لیکن تم بھی ہر پچیسویں سال اپنی نوجوان نسل کو موت کے گھاٹ اتارتے رہو گے۔ ہر پچیسویں سال اپنی نوجوان دلہنوں کو رانڈ اور اپنے بچّوں کو یتیم کرتے رہو گے۔ تمہارے سیاستدان غالباً اُسے دانشوری سے تعبیر کرتے ہوں گے، میں تو اسے خودکشی کہوں گا!"

"ٹام سچ کہتا تھا۔" موبی نے ہنسکر کہا۔"کسی پڑھے لکھے ہندوستانی سے بات مت کرو۔ وہ ہر پھیر کر سیاست پر آجائے گا!"

شام کا لہجہ یکایک نرم پڑ گیا۔ اُس نے شرمندہ سا ہو کر موبی سے کہا۔

"اچھا تو بتاؤ ــــ اور ــــ کیا باتیں کریں"

فِیٹے مُو" موبی چِلّایا۔

شام اور موبی ہنسنے لگے اور وہ ذہنی مغائرت دور ہو گئی . . . .

شام نے موبی کے شانے پر ہات رکھ کر کہا" اچھا . . . آؤ . . . . روئے دلدار کی باتیں کریں . . . . پہلے میں اپنے محبوب کا سراپا بیان کرتا ہوں . . . پھر تمہیں موقعہ دوں گا . . . . سنو . . . اُس کا نام ہے رمو . . . . ."

شام کی آنکھیں خوابیدہ سی ہو گئیں۔ وہ اپنے محبوب کا نام بھی پوری طرح ادا نہ کر سکا کہ وہ نام فضا میں شہد و شکر کی طرح گھل گیا۔ محبوب کا نام لیتے ہی اُس کے لہجے میں ایسی حلاوت آگئی کہ موبی نے اس نام کو اک مدھم، میٹھے سانس کے لمس کی طرح اپنے رخساروں پر محسوس کیا، اُس نے دیکھا کہ رات یکایک زیادہ گہری ہو گئی ہے۔ تارے اک دم جگمگا اُٹھے ہیں۔ ہوا خوشبو ٗ دل

سے معمور ہو گئی ہے، اور جنگ دُور، بہت دُور کسی گہری خندق میں جا چھپی ہے
موبی نے ایک تھکے ہوئے سکون طلب انداز میں اپنا بازو شام کے کندھے پر رکھ دیا اور آہستہ سے کہنے لگا "ایک بار پھر کہو شیمی تاکہ تمہارے ہونٹ تمہارے دلدار کے نام کو ایک بار پھر چوم سکیں . . . . . اد بوائے . . . اد بوائے . . . !!"

شام نے مسکرا کر موبی کا ہات زور سے دبایا اور وہ دونوں سڑک پر چلنے لگے، دو رفیقوں کی طرح، ایک دوسرے کے ہات میں ہات دیئے تاروں کی دُھندلی چھاؤں میں، دھندلکوں اور سیاہیوں کی شبنمی دنیاؤں میں . . . زیرِ آسمان وہ آخری انسان!

وھٹل واڑی میں جو پکنک ہوئی تھی۔ اُس میں حمید اور عذرا بہن نے موبی کو بھی مدعو کیا تھا۔ ایک عرصے کے بعد موبی ان لوگوں سے ملا تھا، اب اُس کا رنگ گہرا سُرخ ہو گیا تھا اور گردن اور چہرے پر خراشوں کے نشان تھے

"بلیاں پالتے رہے ہو گیا؟" حمید نے معنی خیز لہجے میں پوچھا

موتی بے جھجک ہنسا، کہنے لگا۔" نیویارک میں ایک بلّی ہے۔ بس اُسے پالنے کا ارادہ ہے۔ یہ تو جُوجُتسو کے نشان ہیں۔"

" آج کل جُوجُتسو سیکھ رہے ہو؟" پرویز نے پوچھا

" نہیں سیکھ رہا ہوں، عرصہ ہوا میں نے اسے جاپان میں سیکھا تھا۔"

" جُوجُتسو اور باکسنگ ان دونوں میں تم کس کو بہتر سمجھتے ہو؟" پرویز نے پُوچھا۔

" باکسنگ میں مردانگی ہے جُوجُتسو میں چالاکی، باکسنگ میں دیانت ہے جُوجُتسو میں ریاضت، باکسنگ میں مقابلہ سیدھا اور صاف ہوتا ہے۔ جُوجُتسو میں موقعہ شناسی اور عیّاری سے کام لیا جاتا ہے۔" موبی نے اپنی انگلیوں پر گنتے ہوئے کہا

" یہ دونوں کھیلیں دو مختلف اقوام کی فطرت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔" پرکاش نے کہا۔

پرویز نے اصرار کیا۔" پھر بھی تم ان دونوں میں سے کس کو بہتر سمجھتے ہو۔"

عذرا بہن نے کہا" تم موبی سے پوچھ رہے ہو کہ وُہ امریکہ اور جاپان میں سے کس کو پسند کرتا ہے۔"

اس پر ایک قہقہہ پڑا

حمید نے کہا: "جو جتسو میں سمجھتا ہوں سارا اڑنگے کا کھیل ہے۔ اڑنگے پر لاتے ہی کھلاڑی مخالف کو دے پٹختا ہے۔ دراصل اس دنیا میں اڑنگا بڑی چیز ہے۔ شاید وہ کسی یونانی فلسفی کا قول ہے کہ اگر اس کرۂ ارض کو کہیں پر ٹھیک طرح سے اڑنگے پر لایا جائے تو یہ زمین یوں چٹکیوں میں اپنے محور پر اُلٹی گھوم جائے!"

پرکاش نے کہا: "جاپانی یہی کوشش کر رہے ہیں نا۔ لیکن نہیں جانتے کہ اڑنگے پر لانے کے لئے بھی کس قدر قوت درکار ہوتی ہے!"

موبی بولا: "اور قوت باکسنگ ہی سے آتی ہے!" پھر وہ گفتگو کا موضوع بدل کر کہنے لگا: "عذرا بہن اُس روز واڈیا ہال میں آپ نے بنگال کے فاقہ مستوں کے لئے جو ڈرامہ کیا تھا وہ ہمیں بے حد پسند آیا۔"

"تم کہاں بیٹھے تھے؟" ممتاز نے شکایت آمیز لہجے میں پوچھا

"چوتھی قطار میں، میرا کرنل میرے ساتھ تھا۔"

"پھٹے منہ" شام چلّایا

"فٹے مو" موبی نے ہنس کر اپنا ہات بلند کیا۔ "جانتے ہو شیمی میرا کرنل مجھ سے فٹے مو سن کر بے حد خوش ہوتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے اُس نے مجھے جو جتسو گروپ کا آفیسر مقرر کیا ہے اور معلوم ہے نہیں۔ اُس روز تمہارا کھیل

دیکھ کر اُس نے مجھ سے کیا کہا؟ اُس نے مجھ سے کہا..... او بوائے! او بوائے!..... مجھے معلوم نہ تھا کہ ہندوستانی ڈرامے بھی اس بلند پایہ حقیقت نگاری کے حامل ہو سکتے ہیں! اُس نے مجھ سے کہا کہ اب میں بھی ہندوستانی فلمیں دیکھا کروں گا۔ کل ہم اسی جوش میں آ کر شکنتلا دیکھنے چلے گئے..... خیر! شکنتلا بہن تمہارا ناچ تمہارے ڈرامے کی جان تھا۔"

شام نے موبی کو گھورا۔ "اور ہمارا ذکر تک نہیں کرتے ہو بھوتنی کے..... میں اُس ڈرامے کا پروڈیوسر تھا!"

"فٹے مُو" موبی نے اُسے چڑانے کے لئے کہا، شام اُس کی طرف لپکا اور موبی وہاں سے بھاگا۔ شام اُس کے پیچھے پیچھے، ایک سبز ٹیلے پر دونوں خوب گتھم گتھا ہوئے، موبی نے جُوجِتسو سے وار کیا، پھر باکسنگ سے شام نے پہلوانی داؤ سے کام لیا۔ اور ختم نتیجہ میں موبی نیچے تھا اور شام اُس کے اوپر، پھر دونوں ہنس کر اور کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"سنو موبی" پرکاش سمجھانے لگا۔ "یہ جُوجِتسو تمہارے کسی کام کی نہیں"۔

"پہلوانی سیکھو بیا لے" شام نے کہا۔ "کرنل سے کہو کہ وہ اپنے سپاہیوں کو یہ کھیل سکھائے، مجھے ساتھ لے چلو..... ہندی پہلوانی کے

مقابلے میں نہ باکسنگ چلتی ہے نہ جوجِتسو!"

"مگر تمہارے ملک کے تو کسی کام نہ آئی یہ پہلوانی!" موبی نے وار کیا اور اُس نے دیکھا کہ تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ دوسرے لمحے میں ہر ہندوستانی کا چہرہ زرد تھا۔ رنگ اُڑ گیا تھا۔ شام، جو ابھی ابھی اس قدر شاداں و فرحاں نظر آتا تھا اب گردن جھکائے کھڑا تھا۔

"مجھے افسوس ہے، بہت افسوس ہے۔" موبی نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔ "میرا یہ منشا ہرگز ہرگز نہ تھا..."

عذرا بہن نے سنجیدہ رُو ہو کر کہا، "بیٹھو، اب چائے پیو، پھر ندی کے کنارے جا کر بیٹھیں گے اور پرویز سے گانا سُنیں گے۔"

چلتے چلتے موبی نے ڈھل واڑی کی فضا کو اپنے احساسات میں جذب اور جذب ہو جانے کے لئے اپنے تحت شعور کو ماضی کی گرفت سے آزاد کرنے کی کوشش کی اور جوں ہی اس کوشش کے زیر اثر اس کے پرانے محسوسات اور جذبات کا آہنی جال اُس کے شعور، تحت شعور اور لاشعور سے الگ ہوتا گیا، اُس کے جسم و جان میں ڈھل واڑی کا حُسن سرایت کرتا گیا، یہ حُسن زہر نہ تھا۔ یہ حُسن شراب بھی نہ تھا۔ بلکہ ایک اعلیٰ، ارفع مسرت بھری ہنسی کی طرح

بے لوث، معصوم اور تقویت دینے والا جذبہ تھا . . . . وہ آم کے پیڑ کے نیچے اپنے بازو سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا، اور سنکیر کے درختوں کی اُس قطار کو دیکھنے لگا جس کے شعلہ بداماں پھول ندی کے بہاؤ میں خوبصورت چراغوں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ پانی کا مترنم بہاؤ، اک سُریلے گیت کی طرح اُن حسین شمعوں کے گرد لرزتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور اُسے عذرا بہن کا وہ ناچ یاد آیا۔ جب وہ مومی شمعوں کے ہالے میں رقص کرتی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ مادونا کی مسکراہٹ . . . . اور کرسمس کی مومی شمعیں . . . . خدا جانے اُسے کیوں ان ہندی عورتوں کے چہرے مارونا کے سے معلوم ہوتے ہیں، کیوں یہ زمین اُس کی جانی پہچانی معلوم ہوتی ہے، کیوں یہ لوگ اُسے اپنے بھائی بند ہی نظر آتے ہیں یہ پیڑ، یہ زمین، یہ سبزہ، یہ ندی، یہ مغربی گھاٹ کی نیلی چوٹیوں کی اُفق سے اُترتی ہوئی قطار جیسے کنواریاں سر پر گھڑے لئے کسی گھاٹی کی آغوش میں نیچے ندی کو جا رہی ہوں، یہ جروسلم ہے یا دھل وارڈی؟ مندر کا سنہری کلس اور اُس کا ترسول اُس کی آنکھوں میں چمکنے لگا، ترسول صلیب ہی تو ہے! . . . . . ہاں وہی تو ہے! یہ مندر جو ندی کے کنارے ہے، یہ شفق جو ندی میں پھیلی ہوئی ہے یہ کسان جو ندی کے کنارے اپنے کھیت میں ہل چلا رہا ہے۔ کیوں وہ اس

منظر سے صدیوں سے واقف ہے؟ اور واقف ہو کر بھی آج تک ناواقف ہے، انسان اور زمین کی تصویر تو بہت سادہ ہے، اُس میں سبزہ ہے اور پانی ہے اور ہل ہے اور شفق کا سونا ہے اور عبادت کے لئے ایک مندر ہے! اس معصوم تصویر میں کس لئے خونیں نقش و نگار اُبھارے جا رہے ہیں۔ کس لئے کس لئے؟ .....

یکایک پرویز نے کہا "موبی جب میں ندی کے کنارے اس مندر کو دیکھتا ہوں تو میرا جی بے اختیار عبادت کرنے کو چاہتا ہے!"

"کس کی عبادت؟" ممتاز نے شوخی سے پوچھا۔

موبی چیخا "او شیمی او شیمی ادھر آنا عشق ہو رہا ہے"۔

شاہم کچھ دور جھاڑیوں پر سے جنگلی پھول چننے میں مصروف تھا، وہ رومال میں بہت سے پھول بھر کر لایا اور آتے ہی اُس نے یہ پھول ممتاز اور پرویز کے سروں پر ڈال دئے۔ موبی جلدی سے ممتاز اور پرویز کے ہات اپنے ہات میں لے کر ایک پادری کی طرح شادی کا وظیفہ پڑھنے لگا کہ ممتاز نے جلدی سے ہات چھڑا لیا اور سب ہنسنے لگے۔

... ...

پیتل کی گاگریں لئے مرہٹی لڑکیاں مندر کے قریب ایک خوشنما باؤلی پر آتی گئیں اور اُن کی ساڑھیوں کے پچ رنگے کنارے مور کے چھتر کی طرح فضا میں ناچنے لگے۔

پرکاش آہ بھر کر کہنے لگا۔ "جب عورت مسکراتی ہے تو پھولوں پر شبنم چمکتی ہے اور چشمے کا پانی گیت گانے لگتا ہے۔"

حمید نے کہا۔ "اُلّو ہے بے تو، عورت کہیں نہیں ہے، یہ صرف مرد کا تخیّل ہے۔"

عذرا بہن نے حمید کی طرف قہر بھری نگاہوں سے دیکھا۔

لڑکیاں پیتل کی گاگریں سر پر رکھے گھاٹی کے اوپر چڑھتی جا رہی تھیں گھاٹی چڑھ کر اُن کا گاؤں آتا تھا۔ گھاٹی کی پگڈنڈی مہندی کی لکیر تھی جس کی خاک سے کنواریاں سدا سہاگن ہوتی ہیں۔ ڈھل واڑی کا چشمہ امرت ہے۔ ڈھل واڑی کی زمین میں شکر گھلی ہوئی ہے۔ پھر ڈھل واڑی کے گنّے اس قدر میٹھے کیوں نہ ہوں، پھر کنواریوں کے گلے میں رس کیوں نہ ہو، ڈھل واڑی کے گیت گاؤ ڈھل واڑی بلیشواؤں کا سب سے سُندر گاؤں ہے۔"

پرکاش نے جب یہ گیت موہنی کو سنایا تو وہ اُچھل پڑا۔ کہنے لگا۔ "بشمی، اگر

کوئی ہرج نہ ہو تو میں اُن جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر اس پگڈنڈی پر چلتی ہوئی لڑکیوں کی تصویر لے لوں"۔

"کیوں"؟ شام کا لہجہ شبہے سے خالی نہ تھا

"ہم واٹر ورکس کے سماج میں رہتے ہیں بھائی" موبی نے جواب دیا "تم نہیں جانتے، میرے لئے یہ منظر کس قدر عجیب ہے"!

شام نے اجازت دیدی۔ موبی نے کیمرہ درست کیا اور پھر آہستہ آہستہ جھاڑیوں کی اوٹ میں سے ہو کر چلا۔ آخر کار وُہ ایک بڑی جھاڑی کے پیچھے غائب ہو گیا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ وُہ اُس جھاڑی کی طرف دیکھتے رہے اور گھاٹی میں لڑکیوں کا گیت گونجتا رہا۔

پھر جھاڑی کی اوٹ میں سے موبی کا سر بلند ہوا، اُس نے زور سے اک چیخ ماری: "سانپ! سانپ!!" اور وُہ پھر اُسی جھاڑی میں غائب ہو گیا۔

سب لوگ اُس کی طرف لپکے۔ پھر رُک گئے، پھر بڑھے، پھر چیخنے لگے "سانپ! سانپ!!"

پگڈنڈی پر چلتی ہوئی لڑکیوں کے قدم رُک گئے، نغمہ بند ہو گیا۔ وُہ جلدی

جلدی نیچے اُتر آئیں۔

موبی نے سانپ کا سر کچل دیا تھا۔ لیکن اُس کا چہرہ سبز ہوتا جا رہا تھا

موبی نے کہا "سانپ نے —— مجھے —— کاٹ کھایا ہے ——

دیکھو!"

ٹانگ پر —— ٹخنوں سے اوپر —— جلد کا رنگ سبز ہو رہا تھا۔

شام نے کیمرے کا چرمی فیتہ توڑ کر موبی کے گھٹنے کے اوپر کس کر باندھ

دیا۔ ممتاز نے اپنا دوپٹہ شام کے ہات میں دے دیا۔ پھر کہنے لگی۔

"پیاز کھلاؤ، اسے پیاز ..." اور بھاگی بھاگی آم کے پیڑ کے نیچے

پڑے ہوئے سامانِ خورد و نوش میں سے پیاز ڈھونڈھنے گئی۔

گاؤں کی ایک لڑکی بولی "مگر یہ تو افعی ہے، ہائے"!

حمید نے گھبرا کر کہا "اگر اس وقت کہیں سے موٹر مل جاتی"۔

پرکاش بولا "موٹر تو اب شام کے سات بجے آئیگی"۔

گاؤں کی ایک اور لڑکی بولی "مگر یہ تو افعی ہے۔ یہ تو پانچ منٹ میں!

موبی کی حالت ہر لحظہ غیر ہو رہی تھی۔

ایک دُبلی پتلی سانولے رنگ کی لڑکی جھجکتے جھجکتے آگے بڑھی، اُس نے

گاگر سر سے اتار کر زمین پہ رکھ دی، اور پھر آگے بڑھ کر غور سے اُس چھوٹے زخم کے مُنہ کو دیکھنے لگی جو ٹخنوں سے اوپر کی جلد کو سبز کرتا جا رہا تھا۔ پیشتر اس کے کہ کوئی سمجھے کہ وُہ کیا کر رہی ہے۔ اُس نے اپنے ہونٹ اُس زخم سے لگا دیئے اور زہر چُوس کر تھوک دیا۔ ایک بار۔ . . . دو بار . . . موہنی نے اپنا پاؤں ہٹانا چاہا مگر اُس لڑکی نے پاؤں چھوڑا نہیں۔

تیسری بار وُہ اچھل کر پرے ہو گیا اور لڑکی کی گاگر اُلٹ گئی اور ٹھوکر کھا کر شور مچاتی ہوئی ڈھلوان کی جانب لڑھکتی گئی۔ لڑکی اپنی گاگر کی طرف بھاگی۔ ندی کے کنارے پہنچ کر اس نے اُسے پھر پا لیا۔ وہاں اُس نے پانی سے کلیاں کیں۔ ایک جڑی توڑ کر کھائی۔ باؤلی سے پانی بھرا اور پھر گھاٹی پہ چڑھنے لگی۔

یکایک موہنی نے کہا "بات سنو"

لڑکی رُک گئی اور چُپ چاپ اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

"تمہارا نام"

لڑکی نے شرما کر مُنہ پرے کر لیا۔ دوسری لڑکی نے آہستہ سے کہا "موہنی اس کا نام ہے، مگر یہ گونگی ہے" وُہ ہنسی اور موہنی کی نگاہیں زمین پر جھک گئیں۔

"میں اس کے ماں باپ سے ملنا چاہتا ہوں"۔ موبی نے کہا
ایک لڑکی نے بتایا۔ اس کے ماں باپ مر گئے ہیں۔ یہ اپنے چچا کے
ہاں رہتی ہے۔

موبی نے شام سے کہا "مگر ——— اس لڑکی کو فوراً میرے ساتھ
ہسپتال لے چلنا چاہئے"۔

شام نے کہا "چپ رہو بھوتنی کے"۔

لڑکیاں جلدی جلدی آگے بڑھ گئیں۔ موبی وہیں دیر تک محوِ حیرت...!

ہسپتال میں موبی سے ڈاکٹر نے کہا "اچھا ہوا! اس لڑکی نے زہر چوس کر
اُگل دیا۔ ورنہ تمہاری جان نہ بچتی!"

"مگر میں نے تو سانپ کاٹے کا انجکشن ہندوستان آتے ہی لے لیا تھا"
"اس انجکشن میں اس سانپ کے زہر کا تریاق شامل نہیں"۔ ڈاکٹر
اس چھوٹے سے سانپ کے کچلے ہوئے سر کا معائنہ کرنے لگا۔ "جاؤ ———
اب تمہیں کوئی خطرہ لاحق نہیں"۔

موبی کے لبوں پر اک نام آیا "موہنی!"

"چپ رہ بھُوتنی کے!" شام نے کہا

پھر جب موبی شام کے گھر آیا تو جاپانیوں نے آسام پر حملہ کر دیا تھا۔ اور اُسے واپس آسام جانے کا بلاوا آ چکا تھا۔ کل صبح وُہ آسام جا رہا تھا پرکاش بھی فوج میں داخل ہو گیا تھا، وُہ بھی کل ہی جا رہا تھا۔

محفل اُداس تھی۔ ممتاز کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے تھے۔ حمید آج سگرٹ کی بجائے سگار پی رہا تھا۔ عذرا بہن کی آنکھوں کی متانت اور بھی دبیز ہو گئی تھی وُہ پتلیاں آج بے حد پُراسرار تھیں۔

موبی جو ہمیشہ چہکتا تھا۔ آج خاموشی کی حد تک کم گو تھا۔

پرویز نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "تم تو پرل ہاربر کے لئے لڑ رہے ہو لیکن یہ پرکاش کیوں لڑ رہا ہے؟"

شام نے کہا "شاید آج میں بھی فوجی وردی پہنے ہوتا۔ لیکن دل میں وُہ ولولہ نہیں، وُہ اُمنگ نہیں، وُہ جوش نہیں۔ اپنی غلامی کا کس سے انتقام لیں جاپانیوں سے، جاپانی فسطائی ہیں اس لئے۔ انگریز اپنے ملک میں نافسطائی ہوں تو ہوں۔ اس ملک میں تو اکثر اوقات اُن کے طرزِ عمل کو نسطائیوں کے سلوک سے

متمیز" کرنا دشوار ہو جاتا ہے . . . موبی سچ بتاؤ، تم کیوں لڑنے جا رہے ہو
تم اپنی ماں کے اکلوتے بیٹے ہو۔ تم . . . "

موبی نے پہلے بسٹ بیئر کے آٹھ ڈبے جھولے سے نکال کر میز پر رکھ دیئے
کہنے لگا "یہ بیئر میں نے اس دن کے لئے سنبھال کر رکھی تھی۔ آج وہ دن بھی
آن پہنچا، پیئو!"

شام نے ڈبے میں چاقو سے سوراخ کیا اور بیئر کی دھار اُبل کر اُس کے
چہرے پر آ پڑی۔ پھر وہ جلدی سے یہ سنہری سیّال گلاسوں میں انڈیلتا گیا۔
بیئر کا کف گلاسوں کے اوپر بڑھ رہا تھا جس طرح ساحل کی ریت پر سمندر کا
جھاگ اُچھلتا ہے۔

شام نے پوچھا "تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

پرکاش نے جذباتی لہجے میں کہا "مجھ سے پوچھو، میں بتاتا ہوں۔ میں
کیوں لڑنے جا رہا ہوں۔"

"اس لئے کہ تم بیوقوف ہو۔" پردیپ نے کہا "انگریز ہندو کو ہندوستان دیگا
نہ مسلمان کو پاکستان۔ وہ دونوں کو بیوقوف بنا رہا ہے، جاہل کہیں کے!"

"کہنے دو اسے" ممتاز نے کہا۔ "اس کی بات بھی سن لینے دو۔" ممتاز کی

آنکھوں میں آنسو تھے۔

پرکاش نے تشکر آمیز نگاہوں سے ممتاز کی طرف دیکھا۔۔۔ "میں مرنے کیلئے جا رہا ہوں۔ اب واپس نہیں آؤں گا۔ میں جاپانی فسطائیت کے خلاف اپنا خون بہانے جا رہا ہوں"۔

سب ہنس پڑے۔ موبی خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

پرکاش نے کہا "آج مدت کے بعد پیٹ بھر کر پینے کو ملی ہے۔ زبان ترس گئی تھی اس کے ذائقے کو"۔

حمید نے کہا "شاباش بیٹا، مرنے سے پہلے جی بھر کر پی لو"۔

پرکاش کہہ رہا تھا جیسے وہ اپنے آپ سے ہمکلام ہو۔۔۔ "جب میں ذہنی دوراہے پر آگیا تو سوچتا تھا کیا کروں؟ نہ فرنگی فسطائیت اچھی ہے نہ جاپانی پھر؟ کیا کروں؟ چپکا بیٹھا رہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی کربناک ثنویت کا شکار رہوں، اپنے ملک میں انگریزوں اور جاپانیوں کو لڑتا دیکھوں، اپنے کھیتوں کو، اپنے گاؤں کو، اپنے شہروں کو اجڑتا دیکھوں اور ہات پر ہات دھرے خاموش بیٹھا رہوں۔۔۔۔ غلامی کے بعد بے حیائی اور ڈھٹائی کی منزل آتی ہے اور اس منزل پر پہنچ کر ہر قوم مردہ ہو جاتی ہے۔ غلامی سے آزادی

نصیب ہو سکتی ہے۔ لیکن جب کوئی قوم غلامی کی حدود سے گزر کر بے حیائی ڈھٹائی اور بے عملی کا ثبوت دینے لگے۔ تو پھر وہ کبھی آزاد نہیں ہو سکتی، اسی لئے تو میں جاپانی فسطائیت کے خلاف لڑ کر اپنا خون بہا دینا چاہتا ہوں۔ میرا یہ اقدام فسطائیت کے سارے ظالمانہ نظام کے خلاف ہوگا چاہے وہ دُنیا کے کسی حصّے میں کیوں نہ واقع ہو۔ چاہے اُن کے اثرات بعض اتحادیوں ہی میں نمایاں کیوں نہ ہوں۔ میری موت، میری لڑائی اُس فسطائیت کو بھی ضرور کمزور کرے گی جس کی ایک جھلک شاید ہمیں اپنے گھر میں بھی ملتی ہے......!"

پرکاش یکایک چُپ ہو گیا۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ اُس نے بیئر کا گلاس اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

پرویز نے کہا "فرنگی سے کیوں نہیں لڑتے؟ یہ بھی تو مخمل نہیں، ریشم نہیں، دیبا نہیں۔"

حمید نے کہا "غالباً پرکاش دو محاذ پہ بیک وقت لڑنا نہیں چاہتا۔ ہٹلر کا حشر تم دیکھ رہے ہو۔"

سب ہنسنے لگے۔ موبی چُپ تھا۔

شام نے کہا: "بھوتنی کے تم نہیں بولو گے؟"

موبی نے کہا۔ "جہاں تک سیاست کا تعلق ہے، میں خاموش رہوں گا۔ جو ہدایات مجھے ملی ہیں، حتی الوسع ان کی پابندی کروں گا۔ . . . ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ جب میں آیا تو مجھے بہت سی ایسی باتیں کہی گئی تھیں جو ہندوستانی سماج کے متعلق تھیں اور جو بعد میں مشاہدے سے اور تجربے سے غلط ثابت ہوئیں۔ ممکن ہے آج میں ان باتوں کا یہاں اقرار نہ کرتا۔ . . . لیکن فرنٹ پر جا رہا ہوں!"

سب چُپ چاپ اُس کی باتیں سُن رہے تھے۔

"مجھے بتایا گیا تھا کہ ہندوستانی عورتیں بڑی ڈرپوک ہوتی ہیں۔ . . . وہ پردے میں رہتی ہیں اور سفید آدمی کے سامنے سے بھی گھبراتی ہیں۔ . . . اب میں جانتا ہوں کہ حقیقت کیا ہے۔ . . . وہ پردے میں بے شک رہتی ہوں وہ حیا پرور ہیں لیکن ڈرپوک نہیں۔ وہ تمہارے مردوں سے زیادہ دلیر ہیں۔ . . . وہ موت کا مقابلہ بھی کر سکتی ہیں اگر ضرورت پڑے" . . . . .

. . . ! حمید نے طنزاً "موبی نہیں بول رہا، سانپ کا زہر بول رہا ہے!"

موبی نے کہا: "ہر آدمی چاہتا ہے کہ وہ دوسروں کی بُری باتیں سُنے اور اُن پر

اعتبار کرے۔ یہ انسانی فطرت ہے، اسی طرح میں نے بھی تمہارے متعلق بہت سی بُری باتیں سنیں اور اُن پر اعتبار بھی کر لیا تھا۔۔۔ شیمی تمہیں وہ تحفے تحائف والی بات یاد ہوگی۔۔۔ تم مجھے کمینہ سمجھ گئے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ میں آج دن تک تمہارے طرزِ عمل کو اسی کسوٹی پر پرکھتا رہا ہوں۔۔۔ مگر یہ کلیہ بھی غلط نکلا۔

"غلط کیسے؟" شام نے کہا "بھوتنی کے۔ یہ پے لسبٹ جو پلا رہے ہو۔ چالیس روپے کی تو یہ اکیلی بیئر ہوگی، اس پر بھی کہتے ہو۔ ہم مالی فائدہ حاصل نہیں کرتے، کیا بیئر سے اتنا نشہ ہو جاتا ہے تمہیں؟"

موبی مسکرایا، کہنے لگا: میں سیاست نہیں جانتا ہوں، صرف دل دیکھتا ہوں۔ دل پہچانتا ہوں۔ میں نے تمہارے دلوں کو بھی اچھی طرح ٹٹول کر دیکھا ہے۔۔۔ جب میں واپس امریکہ جاؤں گا تو ـــــ

"تو کیا ہوگا؟" پرویز نے پوچھا

موبی نے کہا "کچھ نہیں۔۔۔ سنو! وہ ـــــ شاید کہیں بلبل بول رہی ہے۔"

"بلبل بول رہی ہے؟ یہاں؟ موبی یہ تمہارا واہمہ ہے، یہاں مغربی گھاٹ پر بلبل نہیں بولتی۔" پرویز نے جواب دیا۔

قدرے توقف کے بعد موبی نے آہستہ سے کہا۔۔۔ "مگر، بالکل وہی آواز ہے۔۔۔ یہ نغمہ کہیں دُور سے آیا ہے"! اس کی آنکھیں خوابیدہ ہو گئیں۔

"نیویارک سے"؟ شام نے پوچھا

"ہاں نیویارک سے بھی آسکتا ہے، جہاں میری محبوب رہتی ہے اور اُدھی اُدھر سے بھی جہاں میری ماں رہتی ہے"۔۔۔ موبی یادوں میں کھویا گیا۔۔۔ "یہ میگنولیا کے سپید غنچے میری محبوب کے رخساروں کی طرح تازہ ہیں۔۔۔ میری ماں کے سپید بالوں کی طرح مقدس ہیں"۔ موبی نے گلدان سے میگنولیا کے سپید غنچوں کو چھوا، ہلکے آہستہ، ملائم انداز میں جیسے وہ اُن سے پیار کر رہا ہو۔

پرکاش سسکیاں لینے لگا۔

موبی نے کہا، "شام میں سچ کہتا ہوں، میں پرل ہاربر کے لئے نہیں لڑ رہا"۔۔۔ وہ سوچنے لگا "بس ـــــ شاید ـــــ ان سپید غنچوں کے لئے لڑ رہا ہوں"

اور موبی نے میگنولیا کے سپید پھول اپنے رخساروں سے لگا لئے۔

سب خاموش تھے۔ رات بھی خاموش تھی۔ صرف بیئر کا کف باقی تھا اور دور کہیں بہت دُور شاید کسی بلبل کا نغمہ گونج رہا تھا!

۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔

کئی ماہ گزر گئے۔ موبی کا کوئی خط نہ آیا، شاید سنسر ——— !
پرکاش بخیریت تھا۔
پھر پتہ چلا کہ پرکاش جاپانیوں کے خلاف لڑتے لڑتے مارا گیا۔
پھر بھی موبی کا کوئی خط نہ آیا۔
پرویز نے کہا: "ان امریکنوں کا کیا اعتبار؟ یہاں پر کیسی رفاقت جتاتا تھا اور وہاں جا کر" . . . . اُس نے سگریٹ کی راکھ خاکداں میں پھینک کر اپنی دانست میں موبی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھلا دیا۔
چند ہفتے ممتاز کی نگاہیں کھوئی کھوئی سی رہیں۔ پھر وہ بھی بھول گئی
پھر شام ٹائیفائڈ میں مبتلا ہو گیا۔ علالت کے دوران میں اُسے ایک سنسر شدہ خط ملا۔ یہ اوہیو سے آیا تھا۔ خط کھولتے کھولتے شام نے سوچا۔ بدمعاش واپس اوہیو پہنچ گیا ہے اور ———
خط کی عبارت یہ تھی:۔
پیارے بیٹے،
میں تمہیں اپنا بیٹا کہہ رہی ہوں۔ کیونکہ تم میرے موبی کے دوست ہو۔ اسلئے میں تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ ممکن ہے تم اپنی ماں کی کچھ مدد کر سکو۔ موبی نے مرنے سے پہلے

اپنی وصیت میں تحریر کیا تھا کہ اُس نے وٹھل واڑی میں ایک لڑکی کو اپنی بہن جانا ہے۔ اس لڑکی کا نام "موہنی" ہے۔ موبی نے یہ بھی لکھا تھا کہ تم اُس لڑکی کو اچھی طرح پہچانتے ہو۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اب جب کہ موبی اس جہان میں نہیں ہے۔ تم میری بیٹی کو میرے پاس بھیج دو۔

اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو تو بھی مجھے لکھو۔ تاکہ میں خود ہندوستان آنے کا بندوبست کر سکوں۔ اگر زندگی نے ساتھ دیا تو میں ضرور آؤں گی۔ میں "موہنی" سے ملنا چاہتی ہوں اور اگر ہو سکے تو اُسے اپنے ساتھ گھر لے جانا چاہتی ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم ایک امریکی عورت کی اس تخیل پرستی کو غلط سمجھو اور اسے کوری جذباتیت پر محمول کرو۔ لیکن یہ کوری جذباتیت ہے نہ محض تخیل پرستی۔ یہ اُس خوبصورت حقیقت کا مشاہدہ ہے جسے میرے بیٹے نے اپنا خون دے کر حاصل کیا ہے . . . وہ میرا اکلوتا لڑکا تھا۔

اپنے آخری خط میں اُس نے لکھا ہے کہ جس روز موہنی نے اُس کے ٹخنوں سے زہر چوس لیا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا گویا موہنی نے

یہ زہر اس کے جسم سے نہیں اس کی رُوح سے چُوس کر باہر نکال دیا ہے وُہ زہر جو کالے کو گورے سے، غریب کو امیر سے، اور آدمی کو آدمی سے جُدا رکھتا ہے، اُس وقت اُسے معلوم ہوا کہ محبت ہر خوبصورت انسانی سماج کی پہلی اور آخری شرط ہے اور اس کے بغیر دُنیا میں کوئی انسانی سماج تا دیر نہیں پنپ سکتا۔ . . . وٹھل واڑی کی گھاٹی پر اُسے پہلی بار احساس ہوا کہ محبت کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ کوئی ملک نہیں ہوتا، کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ وُہ زندگی کا آخری اور ابدی آدرش ہے . . . . جب وُہ آسام جا رہا تھا تو وُہ تمہیں یہ سب کچھ بتانا چاہتا تھا۔ لیکن اس قدر شرمیلا لڑکا تھا وُہ ——— میرا بیٹا . . . .
وُہ تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ وُہ بس اس محبت کے لئے لڑ رہا ہے، اُس محبت کے لئے جو آدمیت سے پیدا ہوتی ہے۔ اُس نفرت کے خلاف جس کا منبع فسطائیت ہے . . . . اُس کا خیال تھا کہ جب وہ جنگ سے واپس آئے گا تو تمہیں بتلائے گا۔ اپنے ہموطنوں کو بتائیگا . . . لیکن اب اُس کی لاش آسام کی کسی گھاٹی کے سینے میں چھپی ہے اور اس کے سر پر موت کا صلیب ہے . . . . !

ہر ماں کو اپنے بیٹے کی موت کا دُکھ ہوتا ہے اور پھر میرا تو وہ ایک ہی بیٹا تھا، یہ مشیتِ ایزدی تھی کہ وہ مجھ سے یوں چھن جائے۔ لیکن اُس کا آخری خط پڑھکر مجھے معلوم ہوتا ہے، جیسے وہ کہیں کھو نہیں گیا جیسے وہ اب بھی میرے پاس بیٹھا ہے اور مُسکرا مُسکرا کر مجھ سے کہہ رہا ہے۔ دیکھ ماں، تیرے لئے ایک بیٹی لایا ہوں ... اُس کا خط پڑھ کر آج مجھے پھر اُس عظیم درد اور مسرّت کا احساس ہو رہا ہے جیسے میں نے اپنے بیٹے کو پہلی بار جنم دیا ہو ....

بس اب اور کچھ نہیں لکھ سکتی!

تمہاری ماں

ایستھر

پرویز بھی شام کے قریب جھکا ہوا یہ خط پڑھ رہا تھا۔ خط پڑھتے پڑھتے اُس کی اُنگلیاں سختی سے شام کے ہاتھ پر جم گئیں اور اُس کے مُنہ سے نکلا "موبی!"

شام نے اپنا مُنہ موڑ لیا اور آنسو پونچھ کر اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس نے میگنولیا کے سپید غنچے اپنے رخساروں سے لگا لئے .....

رات خاموش تھی، پھول بھی خاموش تھے .... صرف دُور کہیں بہت دُور شاید کوئی بُلبل نغمہ ریز تھی!

بھگت رام

ابھی ابھی میرے ننھے بچے نے میرے بائیں ہات کی چھنگلیا کو اپنے دانتوں تلے داب کر اس زور سے کاٹا کہ میں چلّائے بغیر نہ رہ سکا اور میں نے غصے میں آ کر اُس کے دو تین طمانچے بھی جڑ دیئے ہیں۔ بیچارہ اُسی وقت سے ایک معصوم پلّے کی طرح چلّا رہا ہے۔ یہ بچے کمبخت دیکھنے میں کتنے نازک ہوتے ہیں لیکن ان کے ننھے ننھے ہاتھوں کی گرفت بڑی مضبوط ہوتی ہے۔ ان کے دانت یوں تو دُودھ کے دانت ہوتے ہیں لیکن کاٹنے میں گلہریوں کو بھی مات کرتے ہیں۔ اس ننھے بچے کی معصوم شرارت سے معاً میرے دل میں بچپن کا ایک واقعہ اُبھر آیا ہے۔ اب تک

میں اُسے بہت معمولی واقعہ سمجھتا تھا اور اپنی دانست میں میں اُسے قطعاً بھُلا چکا تھا۔ لیکن دیکھئے یہ لاشعور کا فلتنہ بھی کس قدر عجیب ہے۔ اس کے سہارے میں بھی کیسے کیسے خفتہ عجائب مستور ہیں۔ بظاہر اتنی سی بات تھی کہ بچپن میں میں نے ایک دفعہ اپنے گاؤں کے ایک آدمی بھگت رام کے بائیں ہات کا انگوٹھا چبا ڈالا تھا اور اُس نے مجھے طمانچے مارنے کے بجائے سیب اور آلوچے کھلائے تھے اور بظاہر میں اس واقعہ کو اب تک بالکل بھُول چکا تھا۔ لیکن ذرا اس بھان متی کے پٹارے کی بوالعجبیاں ملاحظہ فرمایئے۔ یہ معمولی سا واقعہ اک خوابیدہ ناگن کی طرح ذہن کے پشتارے میں دبا ہے اور جُونہی میرا بچہ میری چھنگلیا کو دانتوں تلے دباتا ہے اور میں اُسے پیٹتا ہوں۔ یہ پچیس تیس سال کا سویا ہوا ناگ بیدار ہو جاتا ہے اور پھن پھیلا کر میرے ذہن کی چار دیواری میں لہرانے لگتا ہے۔ اب کوئی اسے کس طرح مار بھگائے۔ اب تو اُسے دودھ پلانا ہو گا! خیر تو وہ واقعہ بھی سُن لیجئے۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں۔ یہ میرے بچپن کا واقعہ ہے۔ جب ہم لوگ رنگپور کے گاؤں میں رہتے تھے۔ رنگپور گاؤں تحصیل اجوڑی کا صدر مقام ہے۔ اس لئے اس کی حیثیت اب ایک چھوٹے موٹے قصبے کی ہے۔ لیکن جن دنوں ہم وہاں رہتے تھے۔ رنگپور کی آبادی

بہت زیادہ نہ تھی۔ یہی کوئی ڈھائی تین سو گھر ہوں گے۔ جن میں بیشتر گھر برہمنوں اور کھتریوں کے تھے۔ دس بارہ گھر جلاہوں اور کمہاروں کے ہوں گے، پانچ چھ بڑھئی اتنے ہی چمار اور دھوبی اور یہی سارے گاؤں میں لے دے کے آٹھ دس گھر مسلمانوں کے ہوں گے، لیکن ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس لئے یہاں تو ان کا ذکر کرنا بھی بیکار سا معلوم ہوتا ہے۔

گاؤں کی برادری کے مکھیا لالہ کانشی رام تھے، یوں تو براہمنی سماج کے اصولوں کے مطابق برادری کا مکھیا کسی براہمن ہی کو ہونا چاہیے تھا اور پھر برہمنوں کی آبادی بھی گاؤں میں سب سے زیادہ تھی، اس پر بھی برادری نے لالہ کانشی رام کو جو ذات کے کھتری تھے، اپنا مکھیا چنا تھا۔ پھر وہ سب سے زیادہ لکھے پڑھے تھے، یعنی نئے شہر تک پڑھے تھے جو خط ڈاکیہ نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اُسے بھی وہ اچھی طرح پڑھ لیتے تھے۔ تمسک ہنڈی، نالش، سمن، گواہی، نشان دہی کے علاوہ نئے شہر کی بڑی عدالت کی ہر کارروائی سے وہ بخوبی واقف تھے، اسلئے گاؤں کا ہر فرد اپنی ہر مصیبت میں چاہے وہ خود لالہ کانشی رام ہی کی پیدا کردہ کیوں نہ ہو۔ لالہ کانشی رام ہی کا سہارا ڈھونڈھتا تھا اور لالہ جی نے آج تک اپنے کسی مقروض کی مدد کرنے سے انکار نہ کیا۔ اسی لئے وہ گاؤں کے مکھیا چلے تھے

گاؤں کے مالک تھے اور رنگپور سے باہر بھی دُور دُور تک جہاں تک وھاں کے کھیت دکھائی دیتے تھے۔لوگ اُن کا جَس گاتے تھے۔

ایسے شریف لالہ کا منجھلا بھائی تھا لالہ بانشی رام، جو اپنے بڑے بھائی کے ہر نیک کام میں اس کا ہات بٹاتا تھا۔لیکن گاؤں کے لوگ اسے اتنا اچّھا نہیں سمجھتے تھے۔کیونکہ اُس نے اپنے برہمن دھرم کو تیاگ دیا تھا اور گورو نانک جی کے چلائے ہوئے پنتھ میں شامل ہو گیا تھا۔اُس نے اپنے گھر میں ایک چھوٹا سا گوردوارہ بھی تعمیر کرایا تھا اور نئے شہر سے ایک نیک صورت، نیک طینت، نیک سیرت گرنتھی کو بُلا کر اُسے گاؤں میں سکھ مت کے پرچار کے لئے مامور کر دیا تھا۔ —————— لالہ بانشی رام کے سکھ بن جانے سے گاؤں میں جھٹکے اور حلال کا سوال پیدا ہو گیا تھا۔مسلمانوں اور سکھوں کے لئے تو گویا ایک مذہبی سوال تھا۔لیکن بھیڑ بکریوں اور مرغے مرغیوں کے لئے تو زندگی اور موت کا سوال تھا۔لیکن انسانوں کے نقار خانے میں جانوروں کی آواز کون سُنتا ہے۔

لالہ بانشی رام کے چھوٹے بھائی کا نام تھا بھگت رام۔یہ وہی شخص ہے جس کا انگوٹھا میں نے بچپن میں چبا ڈالا تھا۔کس طرح یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا ابھی تو اس کا کردار دیکھئے . . . یعنی کہ سخت لفنگا، آوارہ، بدمعاش تھا یہ

شخص۔ نام تھا بھگت رام لیکن دراصل یہ آدمی رام کا بھگت نہیں۔ شیطان کا بھگت تھا۔ رنگپور کے گاؤں میں آوارگی، بدمعاشی ہی نہیں، ڈھٹائی اور بےحیائی کا نام اگر زندہ تھا تو محض بھگت رام کے وجود سے، ورنہ رنگپور تو ایسی شریف روحوں کا گاؤں تھا کہ غالباً فرشتوں کو بھی وہاں آتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہوگا۔ نیکی، پاکیزگی اور عبادت کا ہلکا ہلکا سا نور گویا ہر ذی نفس کے چہرے سے چھنتا نظر آتا تھا۔ کبھی کوئی لڑائی نہ ہوتی تھی۔ قرضہ وقت پر وصول ہو جاتا تھا۔ ورنہ زمین قرق ہو جاتی تھی اور لالہ کانشی رام پھر روپیہ دے کر اپنے مقروض کو پھر کام پر لگا دیتے تھے۔ مسلمان بچارے اتنے کمزور تھے اور تعداد میں اس قدر کم تھے کہ اُن میں لڑنے کی ہمت نہ تھی سب بیٹھے مسجدوں کے میناروں اور اُس کے کنگروں کو خاموشی سے تاکا کرتے کیونکہ گاؤں میں انہیں اذان دینے کی بھی ممانعت تھی، کمیروں اور اچھوتوں کا سارا دھندا دوجنے لوگوں سے وابستہ تھا اور وُہ چوں تک نہ کر سکتے تھے۔ اسکے علاوہ انہیں یہ احساس بھی نہ تھا کہ زندگی اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتی ہے بس جو ہے وُہ ٹھیک ہے۔ یہی مسلمان سمجھتے تھے، یہی براہمن، یہی کھتری، یہی چمار اور سب مل کر بھگت رام کو گالیاں سناتے تھے۔ کیونکہ اُس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔

بھگت رام لٹھ گنوار تھا۔ بات کرنے میں اکھڑ، دیکھنے میں اکھڑ۔ کندہ ناتراش، بڑے بڑے ہات پاؤں، بڑے بڑے دانت، بتیسی ہر وقت کھلی ہوئی، لبوں سے رال ٹپکتی ہوئی۔ جب ہنستا تو بتیسی کے ساتھ مسوڑھوں کی بھی پوری پوری نمائش ہوتی۔ گاؤں میں ہر شخص کا سر گھٹا ہوا تھا اور ہر ہندو کے سر پر چوٹی تھی۔ لیکن بھگت رام نے بلوچوں کی طرح لمبے لمبے بال بڑھا لئے تھے اور چوٹی غائب تھی۔ بالوں میں بڑی کثرت سے جوئیں ہوتیں۔ جنہیں وہ اکثر گھراٹ کے باہر بیٹھ کر چنا کرتا تھا۔ سرسوں کا تیل سر میں دو تین بار رچایا جاتا۔ گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے اور بیچ میں سے سیدھی مانگ نکال کر اور زلفیں سنوار کر وہ سرشام گاؤں کے چشموں کا طواف کیا کرتا۔ اپنی ان بری حرکتوں سے کئی بار پٹ چکا تھا۔ لیکن اس کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ بڑی موٹی کھال تھی اسکی اور پھر میرا خیال ہے کہ اس کے شعور میں ضمیر کی آگ کبھی روشن ہی نہ ہوئی تھی۔ وہ شرارہ ناپید تھا۔ جو حیوان کو انسان بنا دیتا ہے۔ بھگت رام سو فیصدی حیوان تھا اور اسی لئے گاؤں والے برہمن اور کھتری، امیر اور غریب، ہندو اور مسلمان، سنار اور چمار سب اس سے نفرت کرتے تھے۔

لیکن چونکہ لالہ کانشی رام کا چھوٹا بھائی تھا اور بظاہر گاؤں کے سب سے

بڑے گھر کا ایک معزز فرد۔ اس لئے اپنی ناپسندیدگی کے باوجود گاؤں کے لوگ اُس کے وجود کو اور اُس کے وجود کی مذبوحی حرکات کو برداشت کرتے تھے اور آج تک کرتے چلے آئے تھے۔ لیکن جب ہم رنگپور میں آئے۔ اس وقت بھگت رام کے بڑے بھائی نے پریشان ہو کر اُسے اپنے گھر سے نکال دیا تھا اور توی کا ایک گھراٹ اُس کے سپرد کر دیا تھا۔ جہاں بھگت رام کام کرتا تھا اور وُہ رات کو سوتا بھی وہیں تھا۔ کیونکہ گھراٹ تو دن رات چلتا ہے۔ نہ جانے کس وقت کسے آٹا پسانے کی ضرورت درپیش ہو اور وہ چادر میں یا بھیڑ کی کھال میں مکئی یا گندم کے دانے ڈالے گھراٹ پر چلا آئے اور پھر اس کے علاوہ یہ بھی تو ہے کہ دن بھر میں جو گیہوں جمع ہوتا ہے یا جو اناج ابھی پسا نہیں جاتا وُہ وہیں گھراٹ پر دھرا رہتا ہے اور اُس کی نگہبانی کے لئے بھی تو ایک آدمی کا وہاں موجود ہونا ضروری ہے۔ یہی سوچ کر لالہ کانشی رام نے اپنے چھوٹے بھائی بھگت رام کو اپنے گھراٹ کا کام سونپ دیا اور لالہ کانشی رام کا گھراٹ گاؤں میں سب سے نامی گھراٹ تھا یعنی تقریباً سارے گاؤں کا اناج وہیں پسوایا جاتا تھا۔ ایک اور گھراٹ بھی تھا۔ لیکن بالعموم مسلمانوں، اچھوتوں اور کمیروں کے لئے اناج پسایا جاتا تھا۔ یا جب کبھی بڑا گھراٹ چلتے چلتے رُک جاتا اور اُس کی

جب چکی کام کرنے سے انکار کر دیتی یا جب پاٹوں کی سطح پر پتھر سے دندانے بنانے کے لئے اُنہیں اُٹھا دیا جاتا تو اس صورت میں دوسرے گھراٹ والوں کو چند روز کے لئے اچھی آمدنی ہو جاتی تھی۔ بصورت دیگر بڑے گھراٹ پر گاہکوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ جب بڑا گھراٹ چلتا تھا۔ اُس وقت کسی مسلمان، کسی کبیرے، کسی اچھوت کی یہ جرأت نہ تھی، جرأت تو کیا کبھی اُن کے ذہن میں یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ اُن کا اناج کبھی بڑے گھراٹ پر پس سکتا ہے۔ شروع شروع میں جب بھگت رام نے کام سنبھالا تو اُس نے بھی چند روز تک یہی وطیرہ اختیار کیا۔ لیکن بعد میں اس کے مزاج کے لاابالی پن نے بلکہ یوں کہئے کہ شیطانی پن نے زور مارا اور اُس نے سوچا چلو جی کیا ہے اس میں۔ جو آئے آٹا پسا کر لے جائے۔ ان پتھر کے دو پاٹوں میں دھرا ہی کیا ہے اور یہ آخر اناج ہی تو ہے جسے کتا بھی کھاتا ہے اس سے گھراٹ کی آمدنی میں اضافہ بھی ہوگا اور دوسرے گھراٹ کا حال جو پہلے ہی بہت پتلا ہے اور بھی پتلا ہو جائے گا اور عین ممکن ہے کہ دوسرا گھراٹ بالکل ہی بند ہو جائے۔ نہ جانے اس نے کیا سوچا بہرحال اس نے کوئی ایسی ہی بری بات سوچی ہوگی۔ جو اُس نے گاؤں کے چماروں اور کبیروں کو بھی اپنے گھراٹ پر سے آٹا پسانے کی دعوت دی۔ پہلے تو لوگوں نے بڑی شدّ ومد سے

انکار کیا: "بھلا ایسا بھی ہو سکتا ہے، کیا کہتے ہو لالہ، ہم رعیت ہیں۔ تم راجہ ہو، یہ تمہارا گھراٹ ہے، ہمارا گھراٹ وُہ ہے۔ ہم بھلا یہاں آٹا پسانے کیوں آئیں گے نا بابا یہ کام ہم سے نہ ہوگا اور جو چاہے ہم سے کام لے لو۔ پر یہ کام ہم سے نہیں ہونے کا۔" لیکن بھگت رام نے آخر اپنی چالاکیوں سے ان بیچاروں کو پھسلا ہی لیا اور انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وُہ اناج اُسی کے گھراٹ پر لایا کریں گے اور وہیں پسایا کریں گے۔

بھلا ایسی بات بھی برادری میں چھپی رہ سکتی ہے۔ برادری میں اک کہرام مچ گیا چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ہر روز بھگت رام سے لڑائی ہونے لگی۔ تگڑا آدمی تھا اس لئے گالیاں سہہ گیا ہنس ہنس کر ٹالتا گیا۔ پھر اُس نے غصے میں آکر دو چار کو پیٹ دیا۔ پھر ایک دن خود پٹ گیا۔ یہ معاملہ بڑھتے بڑھتے لالہ کانشی رام کے پاس پہنچا۔ انہوں نے بھگت رام کو بلا کر ڈانٹا۔ سمجھایا بجھایا ٹھنڈے دل سے۔ نرمی سے پچکار کر باتیں کیں۔ اُونچ نیچ سمجھائی۔ لیکن جس کے دل میں کمینہ پن ہو۔ وُہ دھرم کرم کی بات کب سُننے لگا بھگت رام نے اس کان سے سُنی۔ اُس کان سے نکال دی۔ پہلے جب بھگت رام اپنے گھر پر رہتا تھا۔ اُس کے لئے تھوڑی بہت روک ٹوک بھی تھی۔ یہ ڈر بھی تھا کہ بڑے بھائی کیا کہیں گے۔ لیکن اب تو وہ دن رات

گھراٹ پر رہتا تھا۔ اب اُسے وہاں روکنے والا کون تھا۔ اب وُہ خود کُھل کھیلا۔ انہی دنوں وُہ بھنگ پینے لگا اور ایک مسلمان فقیر کے ہاں آنا جانا شروع کیا جو اِن دنوں اپنی بیوی اور ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ ندی کنارے ایک تکیئے پر آکر ٹھہرا تھا۔ جوں جوں دن گذرتے گئے۔ بھگت رام گھراٹ کے کام کاج سے غافل رہنے لگا اور دن کا بیشتر حصّہ تکیئے پر چرس اور گانجا پینے میں گذارنے لگا۔ بھائی نے بہتیرا سمجھایا خود گاؤں کے شریف مسلمانوں نے اُس پر نفرین کے آوازے کسے۔ لیکن وُہ تو کسی اور ہی نشے میں چُور تھا۔ چند دن اور گذرے اور پھر پتہ چلا کہ بھگت رام نے نئے شہر جاکر اُس مسلمان فقیر کی بیٹی سے نکاح کر لیا ہے اور اسلام قبول کر لیا ہے سارے گاؤں میں ہلچل سی مچ گئی۔ جب اُنہوں نے بھگت رام کو سیاہ پھندنے والی سُرخ رنگ کی اُونچی ٹوپی پہنے ہوئے دیکھا۔ فقیر تو خیر ڈر کے مارے پھر کبھی اُس گاؤں میں گھسا ہی نہیں اور یہ اُس نے اچھا کیا۔ ورنہ لالہ کانشی رام اور بانشی رام ضرور اُس سے بدلہ لینے کی کوشش کرتے۔ لیکن اپنے بھائی کو اب وُہ کیا کہہ سکتے تھے جو اپنی بیوی کو لے کر پھر گاؤں میں آگیا تھا اور گھراٹ میں اپنے بڑے بھائی کے گھراٹ میں آکر بس گیا تھا۔ دونوں میاں بیوی یہیں رہتے تھے اور بھگت رام اب بڑا خوش تھا اور سفید لٹھے کی شلوار اور سیاہ اچکن کی واسکٹ

جس پر کئی سو گھنڈی دار بٹن لگے ہوئے تھے۔ گاؤں کی گلیوں میں فخریہ گھومتا تھا اور گاؤں کی بہو بیٹیوں پر بلا امتیازِ مذہب و ملت آوازے کستا تھا۔ ایسا دس نمبر کا بدمعاش تھا وُہ، کہ میری ماں جب مجھے گالی دیا کرتیں تو میرے خصائل کا مقابلہ بھگت رام کے اوصاف حمیدہ سے کیا کرتیں اور میں ہمیشہ رو دیتا۔ بھگت رام سے مجھے سخت چڑ تھی۔ ایک تو اُس نے ہمارا دھرم چھوڑ دیا تھا۔ بھلا ایسے آدمی کا کیا اعتبار اور بھگت رام کی شیطنت دیکھو۔ مسلمان ہوتے ہی اُس نے گاؤں کے مسلمانوں کو اُکسانا شروع کیا کہ وُہ مسجد میں منارے پر چڑھ کر اذان دیں لیکن وُہ تو بھلا ہو مسلمانوں کا، کسی نے اُس کی بات نہیں مانی اور ڈرتے ڈرتے کہا کہ گاؤں میں آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا ہے۔ اس پر وُہ بدمعاش بہت ہنسا اور اُس نے خود وضو کر کے مسجد کے منارے پر چڑھ کر اذان دی اور اس کی گونجتی گرجتی ہُوئی آواز وادی کی چوحدی میں۔ ندی کنارے ناشپاتیوں کے جھنڈ میں اور دور دور تک صنوبروں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کی چھاتیوں میں دھمک پیدا کرتی ہوتی گونج گئی اور گاؤں کے ہر برہمن اور کھتری کا دل اک نامعلوم خوف سے بھر گیا۔

گھور کلجگ ہے۔ گھور کلجگ ہے۔ یہ . . . . اب کوئی دن میں ضرور نشکلنکی اوتار پیدا ہوں گے۔ ہے رام . . . ہے رام . . . اور لالہ کانشی رام نے

بھگت رام

برہمنوں سے مشورہ کر کے ایک بہت بڑا یگیہ کیا اور پرائشچت کیا اور اپنے چھوٹے بھائی بھگت رام کو براوری سے خارج اور جائداد سے بے دخل کر دیا اور پُرانے گھراٹ کے پانی کا بہاؤ موڑ کر ایک اور عمدہ سا گھراٹ بنایا۔ پرانا گھراٹ جہاں اب بھگت رام اور اُس کی بیوی رہتے تھے۔ اب بڑی خستہ حالت میں تھا۔ گاہک کم ہوتے ہوتے معدوم ہو گئے مسلمانوں کے جو چند گھر باقی رہ گئے تھے۔ انہوں نے بھی مدد سے ہاتھ کھینچ لیا۔ کیونکہ گاؤں کی سماجی زندگی میں بھگت رام نے جا بجا سوراخ کر دیئے تھے اور اُسے کوئی پسند نہ کرتا تھا۔ انہی دنوں بھگت رام کی بیوی کے ہاں بچہ ہونے والا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ فقیرن بیاہ سے پہلے ہی حاملہ تھی اور وہ فقیر بھگت رام کو جُل دے کر خود فرار ہو گیا تھا۔ کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہاں یہ بات ضرور سچ تھی کہ بھگت رام ہر وقت اپنی بیوی کی دلجوئی میں مصروف رہتا۔ وہ اس کے لیے ہر طرح کی محنت اور مشقت کرنے پہ آمادہ تھا۔ لیکن گاؤں میں اب کوئی اسے کام دینے کے لئے تیار نہیں تھا اور ایسے نوکر کے لئے بھلا اس شریف گاؤں میں کام کرنے کی کیا سبیل ہو سکتی تھی۔ مجھے وہ رات نہیں بھولتی۔ جب بھگت رام کی بیوی کے ہاں بچہ ہونے والا تھا۔ صبح ہی سے بھگت رام نے ہمارے گھر کے چکر لگانے شروع کئے تھے۔ میری ماں کی

منتیں کی تھیں اور اُس کے پاؤں پر اپنا ماتھا ٹیک کر کہا تھا "تم چلو گی ماں تو میری بیوی بچ جائے گی"۔ لیکن میری ماں نے جو بڑے بڑے کھتری گھرانوں اور برہمنوں کے گھر میں دایہ بن کر جاتی تھی۔ بھگت رام کو ٹکا سا جواب دے دیا تھا۔ آدھی رات کے وقت بھگت رام نے چیخ چیخ کر دہائی دی۔ لیکن ہم لوگوں نے دروازہ نہیں کھولا اور مست مار کر سو رہے۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ بھگت رام کی بیوی زچگی میں گئی بچہ پیدا نہیں ہو سکا تھا۔ بھگت رام بہت رویا۔ زار قطار رویا۔ لیکن وُہ کوئی سچے آنسو تھوڑے تھے۔ کسی انسان کے آنسو تھوڑے تھے۔ ایک حیوان کے آنسو تھے۔ جو یونہی اپنی تکلیف پر ٹسوے بہا رہا ہو۔ کیونکہ چند دنوں میں ہی وُہ اُس فقیرنی کو بھول گیا تھا۔ اب اُس نے اپنا مسلمانی نام بھی ترک کر دیا تھا۔ اب وُہ پھر اپنے آپ کو خدا بخش نہیں بھگت رام کہتا تھا اور اسی طرح گاؤں کی گلیوں میں چکر لگاتا تھا۔ لیکن شاباش ہے ہندوؤں کو کہ کسی نے اُسے مُنہ نہیں لگایا حتیٰ کہ اُس کے بھائی بھی اُس سے بات تک کرنے کے روادار نہیں ہوئے اور بھگت رام اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

چند روز کے بعد بھگت رام گاؤں چھوڑ کر کہیں دور چلا گیا۔ تین چار مہینوں کے بعد جو لوٹا تو اُس کے پاس دو تین درجن سانپ تھے اور بہت سے چھچھوندر اور

بھگت رام

تیورے اور ایسے ہی بہت سے جانور اور ایک پنجرے میں ایک خوبصورت مینا تھی جو بہت اچھا گاتی تھی اور میں گھنٹوں اُس مینا کے پنجرے کے قریب ہو کر گانا سُنا کرتا تھا اور گاؤں کے بہت سے لڑکے میری طرح بھگت رام کے پاس آیا کرتے اور اب بھگت رام کے پاس بہت سی جڑی بوٹیاں تھیں۔ جن کے متعلق وُہ کہتا تھا کہ دُنیا کی ہر بیماری کو یُوں چٹکی میں دُور کر سکتی ہیں۔ آہستہ آہستہ لوگ اُس کی طرف کھچنے لگے اور اسے اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی۔ میری ماں کو جو گاؤں کی مشہور دایہ تھیں اور عورتوں کے ہر روگ کا علاج جانتی تھیں۔ بھگت رام کا یہ بھروپ بہت بُرا معلوم ہوتا۔ مگر وُہ اب کیا کر سکتی تھیں۔ ہاں جب کبھی ان دونوں کی مٹھ بھیڑ ہو جاتی وُہ اسے خوب کھری کھری سُناتیں۔ بھگت رام یہ صلواتیں سُنکر ہنس دیتا۔ یا اپنا سر کھجانے لگتا اور پھر اک زور کا قہقہہ لگا کر آگے چل دیتا پرے ۔ رسجے کا چھٹا ہوا بدمعاش تھا وہ . . . .

ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ بھگت رام کی جڑی بوٹیوں کی دھاک سارے گاؤں میں بندھ گئی۔ پھر قرب وجوار کے مریض بھی اس کے پاس آنے لگے۔ اب اُس نے گاؤں کے چھوٹے سے بازار میں ایک چمار کی آدھی دوکان کرائے پر لے لی اور وہاں بیٹھ کر دوائیاں بیچنے لگا۔ آدھی دوکان میں مولو چمار جوتیاں بناتا تھا۔ مولو چمار اور

اُس کی بیوی اور اُس کی بیوہ بہن رام دئی۔ بس یہ تینوں افراد ہر وقت جب دیکھو جوتیاں سیتے رہتے تھے۔ دکان کے دوسرے حصے میں بھگت رام نئے گاہکوں کو پھانستا تھا اور سانپوں کا تماشہ دکھاتا تھا اور اپنی زبان کو سانپوں سے ڈسواتا تھا اور خود سنکھیا کھا کر بتاتا تھا کہ اُس پر زہر کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ اُس کے پاس ایسی تیر بہدف جڑی بوٹیاں تھیں جو ہر قاتل سے قاتل زہر کے لئے تریاق کا حکم رکھتی ہیں۔ الغرض اسی قسم کی جھوٹی گپیں ہانک کر اور شیخیاں بگھار کر وہ اُجڈ گنوار اور بھولے بھالے دیہاتیوں سے ٹکے بٹورتا تھا اور میری ماں کو اُس کی باتیں سُن سُن کر بہت غصہ آتا تھا۔ لیکن ہم لوگ اُس کا کچھ بگاڑ نہ سکتے تھے۔ کیونکہ لوگوں کو اُس پر اعتقاد سا ہو گیا تھا اور اب اُس کی جیب میں روپے بھی تھے اور اُس نے گاؤں سے باہر ندی کے اُس پار مٹی کا ایک کچّا سا گھر بھی بنا لیا تھا۔ جہاں وُہ فرصت کے وقت اپنا چھوٹا سا باغیچہ بنانے میں مصروف ہوتا۔ مجھے بھگت رام سے بڑی نفرت تھی اور میں کبھی اُس کے گھر نہ جاتا تھا۔ لیکن اب وُہ اُس خوبصورت مینا کو جو دکان کے باہر لٹکے ہوئے پنجرے میں گاتی رہتی تھی، اپنے گھر لے گیا تھا۔ اس لئے میں کبھی کبھی اُس کے گھر محض اپنی مینا کو دیکھنے کے لئے چلا جایا کرتا۔ خیریت ہوئی اُس نے مجھے ٹوکا نہیں۔ ورنہ میرا ارادہ تو یہ تھا کہ اگر

اُس نے مجھے کبھی ٹوکا تو گوپتے ہیں ڈھیلا رکھ کر بھگت رام کا سر پھوڑ دوں گا!
بھگت رام کا کام اب ترقی پر تھا۔ لیکن انھی دنوں اُس نے ایک ایسی حرکت کی کہ گاؤں کے لوگ پھر اُس سے بدظن ہو گئے اور اِس واقعے کے بعد گاؤں میں اور قرب وجوار کے گاؤں میں کبھی اُس کی ساکھ نہیں بندھی۔ واقعہ دراصل یہ تھا کہ رام دئی جو کہ مولو چمار کی بیوہ بہن تھی لالہ بانشی رام کی داشتہ تھی اور ہر ممکن احتیاط کرنے کے باوجود حاملہ ہو گئی تھی اور لالہ بانشی رام نے درپردہ بھگت رام کو کہلا بھیجا تھا کہ وہ کوئی ایسی دوائی دے جس سے رام دئی کا حمل اسقاط ہو جائے۔ لیکن بھگت رام تو ایک چھٹا ہوا تھا وہ بھلا ایسے موقعے پر کسی شریف آدمی کی کیونکر مدد کرتا۔ چنانچہ اُس نے صاف انکار کر دیا۔ اُلٹا اُس نے معاملے کی یہاں تک تشہیر کی کہ لالہ بانشی رام کو چند ماہ کے لئے گاؤں چھوڑ کر نئے شہر جانا پڑا اور رام دئی کے لئے مُنہ چھپانا مشکل ہو گیا۔ یہ واقعہ اب اس قدر مشہور ہو چکا تھا کہ جب لالہ بانشی رام کے بڑے بھائی کانشی رام نے میری ماں کو جو اُنکی خاندانی دایہ تھی۔ اس نازک معاملے کو اپنے ہات میں لینے کے لئے کہا تو اُنہوں نے بھی صاف انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیچاری رام دئی نو مہینے اُس حرامی بیٹے کو اپنے پیٹ میں لئے لئے پھری اور گاؤں بھر میں اُس کی بے عزتی ہوئی اور

حرامی بچہ اُس نے اُگل جنا۔ اس پر اُس کی برادری نے اُسے ذات باہر کر دیا۔ اور اُس کے بھائی نے اور اُس کی بیوی نے اُسے گھر سے باہر نکال دیا۔ اس حالت میں جب اُس کا کوئی یار و مددگار نہ تھا اور جب وہ کئی دن سے دربدر کی ٹھوکریں کھاتی پھر رہی تھی اور اپنے بچے کو دودھ دینے کے لئے خود اُس کے تھنوں میں دودھ نہ رہا تھا۔ وہ بھگت رام کے گھر پہنچی۔ وہ بدمعاش تو جیسے اُس کے انتظار میں ہی تھا۔ اُس نے جھٹ اُسے اپنے گھر میں رکھ لیا اور بغیر کوئی شادی بیاہ کئے یونہی وہ لوگ ہنسی خوشی رہنے لگے۔ گاؤں میں اس سے پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ یہ اندھیر گردی —— یہ بے راہروی —— بے شرمی، بے حیائی۔ اپنی آنکھوں سے تو دیکھی نہ جا سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھگت رام کی دوکان اٹھوا دی گئی اور اُسے اچھی طرح بتا دیا گیا کہ اس واقعے کے بعد اگر وہ کبھی گاؤں کا رُخ کرے گا تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

بھگت رام اب اپنے گھر ہی میں رہتا تھا اور باغیچے اور گھر کے آس پاس جو اُس نے تھوڑی سی زمین مول لی تھی اُس میں کاشت کر کے اپنا اور رامدئی اور اُس کے حرامی بچے کا پیٹ پالتا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بڑی اُداس زندگی بسر کرتا ہوگا۔ یہ خیال بالکل غلط ہے جیسے چکنے گھڑے پر پانی کا کوئی اثر

نہیں ہوتا۔ اسی طرح ان تمام واقعات نے بھگت رام کی فطرت پر کوئی اثر نہیں کیا۔ اس کی سرشت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اسے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ اس نے کوئی گناہ بھی کیا ہے۔ اسے اس امر کا خیال ہی نہیں تھا کہ اس نے اپنے طرزِ عمل سے اپنے ماں باپ، اپنے خاندان، اپنے گاؤں کی عزت کو بٹہ لگایا ہے۔ وہ اسی طرح خوش و خرم اور شاداں و فرحاں نظر آتا تھا کہ جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا جیسے وہ اب بھی گاؤں کے اندر اپنے بھائی کے خوبصورت گھر میں جس کی چھت ٹین کی تھی رہتا ہو۔ میں نے ایک دن اسے اس کے گھر میں دوپہر کے وقت دیکھا تھا۔ وہ آنگن میں ایک چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا اور رام دئی کو چوم رہا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کسی مرد اور عورت کو چومتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے یہ منظر دیکھ کر میں تو اکدم بھونچکا رہ گیا اور میرے کانوں میں ایک دم میری ماں کے الفاظ گونج گئے "کبھی بھول کر بھی بھگت رام کے گھر کا رُخ نہ کرنا۔ وہ بڑا ہی بدمعاش ہے۔" میری ماں نے سچ کہا تھا۔ بھلا شریف لوگ کہیں ایسے ہوتے ہیں۔ غم و غصّے سے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں واپس جانے کو تھا کہ مینا نے مجھے دیکھ لیا اور جلدی سے چلانے لگی: "آؤ آؤ ننھے منھے بالک مٹھائی دوں گی۔ آؤ آؤ ننھے منھے بالک مٹھائی دوں گی۔" مینا کی آواز سن کر بھگت رام

جلدی سے اُٹھا اور میری طرف بڑھا، شاید وُہ مجھے پکڑنا چاہتا تھا۔ بدمعاش میں تیرے قابو میں آسانی سے نہیں آؤں گا۔ خونی، ڈاکو، مَیں روتا ہوا آگے آگے بھاگا، پیچھے پیچھے بھگت رام دوڑتا ہوا آ رہا تھا کہ رہا تھا" بات تو سن بیٹے، بات تو سن بیٹے"۔ پر میں ایسا بیوقوف نہ تھا کہ رُک جاتا میں بھاگتا گیا۔ یکایک اُس نے مجھے گردن سے پکڑ لیا اور مَیں نے کنکنا کر اُس کے انگوٹھے کو اپنے دانتوں تلے دبا لیا اور اتنے زور سے کاٹا کہ وُہ درد کی شدت سے چیخ اُٹھا مگر اُس نے مجھے طمانچے نہیں مارے، کچھ نہیں کیا، لیکن مجھے چھوڑا بھی نہیں، وُہ مجھے اپنے گھر کے اندر آنگن میں لے گیا۔ مجھے گردن سے پکڑے ہوئے تھا کمبخت، میں اب بھاگ بھی نہ سکتا تھا۔ اُس نے رام دئی کی طرف اشارہ کر کے کہا: یہ تمہاری موسی ہیں۔ انہیں رام رام کہو"۔

مَیں نے کہا" موسی تمہاری ہوں گی۔ مَیں انہیں رام رام نہیں کہوں گا"۔

اُس نے ہنس کر کہا: دیکھو یہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔ منو اس کے ساتھ کھیلو۔

مَیں نے کہا" میں اس کے ساتھ نہیں کھیلوں گا۔ میری ماں کہتی ہیں۔ رام دئی کا بچہ حرامی ہے! حرامی ہے یہ بچہ۔ . . !"

معاً رام دئی نے بچے کو اپنی چھاتی سے چمٹا لیا۔ بھگت رام کھلکھلا کر ہنس پڑا

اور اُس کے بدصورت کریہہ دانت اور مسوڑھے ہونٹوں کے باہر نکل آئے۔ کہنے لگا "سیب کھاؤ گے؟ سیب کھاؤ گے؟ آلوچے؟ آلوچے؟ ہا ہا ہا!"

مَیں نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔

اُس نے زبردستی بہت سے سیب اور آلوچے میری جیبوں میں ٹھونس دیئے۔ پھر مسکرا کر بولا "یہ مینا تمہیں اچھی لگتی ہے نا، لے جاؤ اسے۔"

وُہ پنجرا اتار کر میرے حوالے کرنے لگا۔

مَیں نے کہا "کوئی تھوکتا بھی ہے اس تمہاری مینا پر۔ میری ماں کہتی ہیں کہ بھگت رام آدمی نہیں حیوان ہے۔ وُہ تو چمار سے بھی بدتر ہے، چھوڑ دو مجھے مجھے نہیں چاہئے تمہاری مینا وینا۔۔۔۔"

اُس نے ہنس کر مجھے چھوڑ دیا۔ کہنے لگا "تو اب بھاگ جاؤ۔"

اُس بدمعاش کے پنجے سے نکل کر جو میں بھاگا ہوں تو سیدھا گھر آ کے دم لیا گھر آ کر ماں کو جو میں نے سارا قصہ سُنایا تو پہلے تو مجھ پر بہت بگڑیں پھر بھگت رام کو اُنہوں نے خوب خوب کوسا اور سارے سیب اور آلوچے اُٹھا کر گلی میں پھینک دیئے۔

اُس کے بعد میں کبھی بھگت رام کے گھر پر نہیں گیا۔

چند مہینوں کے بعد جب لالہ بانشی رام نئے شہر سے لوٹا تو اُس نے مولو چمار سے کہہ سُن کر بھگت رام پر بدچلنی اور اغوا کا مقدمہ دائر کرا دیا۔ چھ سات مہینے بھگت رام جیل میں رہا۔ آخر کار وہ بری ہو گیا۔ لیکن جیل میں رہ کر اُس کی صحت کافی کمزور ہو گئی تھی اور اب وہ جیل سے چھوٹ کر آیا تو لوگ کہتے تھے کہ اُس کے چہرے پر وہ پہلی سی بشاشت نہ تھی۔ نہ وہ اب پہلے کی طرح سینہ تان کر چلتا تھا۔ کچھ جھکا جھکا سا تھا۔ کچھ اُداس اُداس۔ لیکن یہ کیفیت بھی چند روز تک رہی۔ پھر وہ اسی طرح ڈھیٹ بے شرم بے حیا بن کر ادھر اُدھر گھومنے لگا اور گاؤں گاؤں جا کر اپنی جڑی بوٹیوں کی تجارت کرنے لگا۔ لیکن شریف لوگ اُسے مُنہ نہیں لگاتے تھے اور اس کے سائے سے پرہیز کرتے تھے۔ ہندو، مسلمان، کمیرے، ہر مذہب اور ہر جات کے لوگ اُسے آوارہ اور شہدا سمجھتے تھے اور ہمارے گاؤں میں تو اُس کی بُرائی ضرب المثل بن چکی تھی اور مائیں ہمیں درسِ اخلاق دیتے وقت کہا کرتی تھیں "دیکھو جی، اگر کوئی بُرا کام کرو گے تو تمہارا بھی وہی حال ہو گا جو بھگت رام کا ہوا ہے"

جیسی بے معنی، بے مطلب اُس کی زندگی تھی۔ ویسی ہی اُس کی موت تھی، بالکل مہمل، لایعنی . . . . . .

میں نے اُسے مرتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن جن لوگوں نے اُسے مرتے ہوئے

دیکھا ہے۔ وہ بھی اُس کے پاگل پن پر آج تک ہنستے ہیں۔ کہتے ہیں۔ مرنے سے پہلے وہ بالکل ہشاش بشاش تھا۔ ندی کے کنارے رام دئی کے ساتھ کھڑا تھا اور اُن طوفانی لہروں کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ جو برساتی بارش کی وجہ سے ندی کی سطح کو گرداب فنا بنائے ہوئے تھیں۔ یکایک اُس نے اپنے کنارے کے قریب بھیڑ کے تین چار بچوں کو دیکھا جو اِن ہلاکت آفریں لہروں کی گود میں خوفزدہ آوازیں با آبا آ کہتے ہوئے بہتے چلے آ رہے تھے۔ ایک لمحے کے لئے بھگت رام نے اُن کی طرف دیکھا۔ دوسرے لمحے میں وہ ندی کی طوفانی لہروں کی آغوش میں تھا اور بھیڑ کے بچوں کو بچانے کی ناکام سعی کر رہا تھا۔ اسی کوشش میں اُس نے اپنی جان بھی دے دی۔ دوسرے دن جب طوفان تھم گیا تو اُس کی لاش ندی کے غربی موڑ پر ٹنگ کے ایک تنے سے لپٹی ہوئی پائی گئی۔ جس کا آدھا حصہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کیسی جاہلانہ، احمقانہ، بیوقوفانہ موت تھی یہ۔ حیوانی زندگی کی حیوانی موت۔ حسن ترتیب اور حسن توازن سے عاری۔ بھلا ایسی موت میں بھی کوئی تُک ہے . . . . لیکن اُس کے اچھے بھائیوں نے اچھا کیا۔ اُسے معاف کر دیا اور گو وہ برادری سے خارج ہو چکا تھا۔ اور اب وہ نہ ہندو رہا تھا نہ مسلمان نہ اچھوت، پھر بھی اُنہوں نے اپنے دھرم کے مطابق اُس سے اچھا سلوک کیا۔ وہ اُس کی لاش کو گھر لے گئے۔ اُسے نہلایا دھلایا

اور اپنے رسم و رواج کے مطابق اُسے شمشان گھاٹ لے جا کر اُسے آگ لگا دی
میں اُس وقت وہیں موجود تھا۔ . . .

لیکن یہ ۱۹۲۰ء کی بات ہے۔ آج ۱۹۴۴ء ہے اور میرے ننھے بیٹے نے میری چھنگلیا کو زور سے کاٹ کھایا ہے اور میں نے غصے میں آ کر اُسے دو تین طمانچے جڑ دیئے ہیں اور معصوم بچہ صوفے میں مُنہ چھپائے رو رہا ہے اور میں سوچتا ہوں۔ آج میں یہ سوچتا ہوں بھگت رام کہ تم جو دس نمبر کے بدمعاش تھے اور تمہارا کوئی مذہب نہ تھا۔ تم جو ایک گنوار اجڈ، جھوٹے پنساری تھے اور جڑی بوٹیاں بیچتے تھے اور لوگوں کو ٹھگتے تھے اور اُن سے روپیہ بٹورتے تھے اور ایک مسلمان فقیرنی سے نکاح کئے ہوئے تھے اور ایک اچھوت بیوہ سے جھوٹ موٹ کا بیاہ رچائے ہوئے تھے بھگت رام تم جو جیل کی ہوا کھا چکے تھے اور گاؤں بھر کے مانے ہوئے لفنگے اور غنڈے تھے۔ . . . تم جس سے لوگ نفرت کرتے تھے اور شاید آج بھی کرتے ہیں، ایک میرے گاؤں میں ہی میں نہیں، ہر گاؤں میں، ہر شہر میں۔ ہر جگہ میں۔ . .
. . . آج میں یہ سوچتا ہوں بھگت رام شاید میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔ شاید میں نے تمہیں پہچاننے میں غلطی کی، شاید تم ان تمام بڑے آدمیوں سے بڑے ہو

اچھے ہو۔ بہتر ہو، جو ریلیں بناتے ہیں اور لوگوں کو بھوکا مرجانے دیتے ہیں جو اونچی اونچی عمارتیں بناتے ہیں اور خدا کی مخلوق کو گلیوں میں ننگا پھرنے پر مجبور کرتے ہیں جو نادار عورتوں سے اُن کی عصمت چھین کر عصمت پرست بنتے ہیں جو اپنی وقتی بیویوں کے لئے قحبہ خانے اور اپنی اولاد کے لئے یتیم خانے تعمیر کرتے ہیں اور سماج کے مندر میں بیٹھ کر اُن پر لعنت بھیجتے ہیں۔ ہاں تم اُن سب آدمیوں سے بڑے ہو جو ٹریکٹر، ہوائی جہاز، سکول، مشین گن، تھیٹر، سینما، ایمپائر بلڈنگ ناچ گھر، بنک، یونیورسٹی سلطنت، تخت طاؤس، کتبے، اُپنشد، فلسفہ، زبان اور ادب کی تخلیق کرتے ہیں اور آدمی کی نسل کو کائنات کی تاریکی میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے حیران و پریشان چھوڑ دیتے ہیں۔ تم ان سب آدمیوں سے بڑے ہو۔ اچھے ہو۔ بھگت رام کیونکہ تم پنساری ہو۔ جڑی بوٹی فروخت کرتے ہو۔ آوارہ مزاج ہو۔ نہیں نہیں تم سچ مچ شاعر ہو۔ بھگت رام۔ تم وہ شاعر ہو جو ہر صدی میں ہر برس میں، ہر جگہ، ہر گاؤں میں پیدا ہوتا ہے۔ لیکن لوگ اچھے لوگ نیک لوگ بڑے لوگ اُسے سمجھنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ تم وہ شاعر ہو دوست آؤ، ہات ملاؤ!

لیکن بھگت رام اب مجھ سے ہات نہیں ملا سکتا۔ کیونکہ وہ مرچکا ہے

بھگت رام

سنہ ۱۹۲۰ء کی طغیانی میں بھیڑ کے بچوں کو بچاتے ہوئے مر گیا تھا اور وہیں ندی کے کنارے اُس کی چتا جلائی گئی تھی اور کوئی اُس کی موت پر رویا نہ تھا۔ اور اُس کی چتا سے شعلے بلند ہو کر آسمان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لال لال شعلے، شعلوں کے پتے، شعلوں کی کلیاں، شعلوں کے پھول اُس کی چتا سے کھل رہے تھے اور چتا جل رہی تھی اور کسی کی آنکھ میں آنسو نہ تھے اور قدرت بھی اُداس نہ تھی۔ آسمان صاف تھا۔ نیلا، گہرا، خوبصورت، دھوپ بھی صاف تھی۔ کھلی ہوئی چمکدار، نرم اور گرم اور کہیں کہیں بادلوں کے سپید سپید سبک اندام، راج ہنس تیر رہے تھے اور ندی کا پانی گیت گاتا ہوا، بھنور بناتا ہوا، لہروں کے جال تنتا ہوا اُس کی چتا کے قریب سے گذر رہا تھا اور چتا کے پاس ہی کھٹے اناروں کے جھنڈ میں شعلہ بداماں پھول دہک رہے تھے۔ کائنات خوش تھی، خدا خوش تھا۔ خود شاعر خوش تھا۔ کیونکہ آج اُس کا دل شعلہ بن گیا تھا اور اُس کی روح پھول۔ یہ شعلے جو تمہارے دل میں ہیں۔ یہ پھول جو ہر جگہ ہیں جو تمہارے اندر ہیں اور میرے اندر ہیں اور پھر اندر، اور باہر، سب جگہ، ہر جگہ، کائنات اور شاعر اور آدمی ایک ہوگئے تھے۔ ایسی موت کسے نصیب ہوتی ہے بھگت رام!

......

شمع کے سامنے

میرا گاؤں ابھی دس کوس دور تھا، سہ پہر کے سائے لمبے ہو گئے تھے، خچر کے قدم سست پڑ گئے تھے اور ڈھلوان پگڈنڈی کے دو رویہ سنبلو، نباتھ اور بھیکڑ کی جھاڑیوں میں بٹیروں، بنسیوں اور رت چڑیوں نے سر کنا، پھدکنا اور شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ کہیں کہیں کوئی جھینگر خوش الحانی سے پکار اُٹھتا اور پھر اکدم چپ ہو جاتا۔ شاید اس نے بھی سہ پہر کی گھٹتی ہوئی دھوپ اور مٹتی ہوئی حدت میں شام کے سہانے خنک آمیز معطر سانس کو چھو لیا تھا اور اسی لئے بیقرار ہو کر چیخ رہا تھا۔ پھر وہ یکا یک چپ ہو جاتا۔ جیسے اُسے ابھی شام کی

آمد کا یقین نہیں ہے، ابھی نہیں، ابھی نہیں، شائد شام ابھی نہیں آئے گی، پھر کہیں سے ہوا کا کوئی لطیف جھونکا اُس کے قریب سے گذر جاتا اور اُسے اپنے محبوب کی آمد کا یقین ہو جاتا اور وُہ جھاڑی کی ٹہنی سے لگا ہوا وہیں مسرت سے چیخ اُٹھتا، آئے گی، آئے گی، شام ضرور آئے گی، اسی آس یاس کے درمیان کہیں خوشی کی منزل ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن میرا گاؤں تو ابھی دس کوس دُور تھا اور میرا خچر تھک چکا تھا اور بھوک سے بے تاب ہو کر بار بار کان ہلاتا، رُک جاتا نتھنے پھٹپھٹاتا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ شاید کہیں منزل کا سُراغ ملے، ایڑی کی پیہم ضربوں نے آخر کار اسے اس مقام پر پہنچا دیا۔ جہاں وُہ ڈھلوان پگڈنڈی ختم ہوتی تھی اور نیچے پہاڑی کسّی پر چیڑھ کے ناتراشیدہ کندوں کا بنا ہوا پُل تھا۔ نئے نئے کندوں سے جنگل کی مہک آرہی تھی۔ یہاں پہنچکر میرا خچر کھڑا ہو گیا اور ہزار کوشش کے باوجود اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ ناچار میں اُتر پڑا اور لگام ہاتھ میں لے کر اسے پتھر کی باؤلی کی طرف کھینچ کر لے گیا جو پہاڑی کسّی کے بالکل کنارے پر بنی ہوئی تھی اور روایت کے مطابق آج سے ہزاروں برس پہلے پانڈؤں نے بنائی تھی۔ یہاں پر خوبانی کے درخت تھے اور ایک چھوٹی پھگواڑی، میں نے پھگواڑی سے خچر کو باندھا اور راتب نکال کر اُس کے

سامنے رکھا، پھر جھولے میں سے اپنے لئے مکئی کی روٹی اور گنیار کا ساگ نکالا، کاش،
اس وقت کہیں سے ایک سبز مرچ مل جاتی اور تھوڑی سی چٹنی ....

وہ ایک مرتبہ پہلے بھی یہیں اپنے کام کے سلسلے میں اس راستے سے گذر چکا
تھا۔ باؤلی سے چند قدم کے فاصلے پر دھان کے کھیتوں کا ایک وسیع و عریض سلسلہ
تھا اور جہاں یہ کھیت ختم ہوتے تھے۔ وہاں سے چمن کوٹ کی بستی شروع ہوتی تھی
چمن کوٹ کے گاؤں میں میرا ماموں اللہ داد خاں رہتا تھا اور سارے علاقہ میں اپنی
ڈکیتی کے لئے بہت مشہور تھا۔ بخلاف اس کے میرا باپ سرکاری ملازم تھا اور
یوں بھی ہمارے رنگ پور کے گاؤں والے بہت ہی امن پسند واقع ہوئے ہیں
اس لئے اپنی قرابت داری کے باوجود میں نے کبھی چمن کوٹ میں اپنے ماموں کے
ہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس وقت بھی جبکہ دن تیزی سے ڈھل رہا تھا، میں نے
یہی بہتر سمجھا کہ جس طرح بھی ہو یہ سفر طے کر کے رنگپور پہنچ جاؤں۔ میرے پاس
اپنے بھاری بھرکم بٹوے میں سرکاری لگان کی ایک اچھی خاصی رقم تھی اور گو اللہ داد
میرا ماموں تھا اور دونالی میرے پاس تھی اور پیٹی میں کارتوس بھرے ہوئے تھے اور
میرا نشانہ دور دور تک ضرب المثل تھا۔ پھر بھی رات یہاں بسر کرنے کے لئے میری
دُور اندیشی صلاح نہ دیتی تھی۔ ذرا یہ خچر سستا لے تو پھر جیسا بھی ہو میں اسے

گھسیٹ کرلے چلوں گا۔ کھانا کھا کر میں نے خچر کی طرف دیکھا۔ اُس نے بھی اپنا راتب ختم کر دیا تھا۔ میں نے اسے پچھاڑی سے کھول کر راس اُس کی ایال پر رکھ دی اور اسے باؤلی کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا، پھر میں گھٹنے ٹیک کر باؤلی پر جھک گیا اور میرے ہونٹ باؤلی کے پانی سے ہم سطح ہو گئے۔ مجھے اس طرح پانی پینے میں بہت مزا آتا ہے۔ یہ لطف اوک میں نہیں ہے۔ خچر بھی میرے قریب ہی پانی پی رہا تھا یکایک وہ اپنی تھوتھنی بڑھا کر بالکل قریب آ گیا حتیٰ کہ میں اُس کی گرم سانس کو جس میں گھاس اور چنوں کی ملی جلی خوشبو بسی ہوئی تھی، اپنے رخساروں پر محسوس کرنے لگا۔ میں نے آہستہ سے اس کی تھوتھنی کو پرے کر دیا۔ آخر یہ کونسا طریقہ ہے محبت کرنے کا؟

"یہ باؤلی جانوروں کے لیئے نہیں ہے" عقب سے کسی نے کہا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ دو عورتیں گھڑے لئے کھڑی تھیں۔ دونوں میں سے کسی نے کہا ہو گا دونوں جوان تھیں۔ دونوں حسین، دونوں متبسّم، دونوں کی رنگت زیتونی تھی، آنکھیں سیاہ اور بڑی بڑی، ہاں ایک کی ٹھوڑی خمیدہ تھی، دوسری کی گول اور ملائم، ناشپاتی کی طرح، دونوں پیروں سے ننگی تھیں، انہوں نے سیاہ گگربال پہن رکھی تھیں اور گگھریوں کے اوپر سیاہ رنگ کی قمیض تھی۔ ہاتھ پاؤں محنت و مشقت کے سخت

عادی معلوم ہوتے تھے، کلائی سے لے کر انگلی کی آخری پور تک اور ٹخنوں سے لے کر پاؤں کے ناخن تک جلدی رنگت زیتونی نہ تھی، بھوری تھی، کبھی زیتونی ہوگی کبھی بھوری بھی نہ رہے گی، جب جوانی گذر جائے گی تو ہاتھ پاؤں دونوں سیاہی مائل ہوں گے اور ناشپاتی کی طرح پکی ہوئی زیتونی جلد میں وقت اپنے تیز چاقو سے شگاف پیدا کرے گا اور جھریاں تعمیر کرتا جائے گا اور رخساروں کا سونا اُڑ جائیگا، اور ——— مگر اندھے فیلسوف! اس وقت تو دیکھ! آنکھوں میں جوانی ناچ رہی ہے، تبسم ریز لب کانپ کانپ جاتے ہیں۔ رخساروں کے سیب چمک رہے ہیں، جیسے شفق کی ڈالیاں جُھک گئی ہیں اور مغربی آسمان کے باغ کی رعنائی بہار ان دو مجسموں میں اُتر آئی ہے، میں حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ ان میں سے ایک وُہ جس کی ٹھوڑی خمیدہ تھی، بولی: "یہ باؤلی جانوروں کے لئے نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ہر انسان جانور ہوتا ہے، جو پانی پیتا ہے، وُہ جانور ہے کیا آدمی، کیا خچر، پیو بیٹا!" یہ کہہ کر میں اپنے خچر کو جو میری طرح حیرت سے ان دو عورتوں کو تک رہا تھا (ہا! اس مُلک میں بیچارا خچر بھی جنسی بھوک سے مبرا نہیں) تھوتھنی سے پکڑ کر پھر زبردستی پانی پلانے لگا،

خمیدہ ٹھوڑی والی کی نگاہیں آتش بار ہوگئیں۔ وُہ جلدی سے آگے بڑھی اور اُس نے راس پکڑ کر خچر کو اپنی طرف کھینچا۔ خچر اچھل کر واپس بھگواڑی کے پاس جا رہا۔ اسی اُچھل کُود میں اس نے دولتی جو جھاڑی تو شعلہ ساماں حسینہ کا گھڑا چُور چُور ہو گیا۔

میں ہنسنے لگا، دوسری عورت جسے اُس کی ٹھوڑی کی مناسبت سے ناشپاتی کہنا چاہیئے، کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے مرجانہ؟" پہلی عورت نے غصّہ سے کہا اور جھٹ مرجانہ کے ہاتھ سے گھڑا لے کر ندی میں پھینک دیا لہروں کے زیر و بم میں گھڑا بہت سا فاصلہ صحیح و سلامت طے کر گیا۔ ہم مبہوت کھڑے اس کا سفر دیکھ رہے تھے، پھر اک بڑی لہر نے اسے اک اونچی چٹان کے کنارے سے ٹکرا دیا اور اک چھناکے کے ساتھ بے چارہ وُہ بھی۔ . . .

"ہائے . . . . ہائے . . . ." میں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"کیوں ہنستے ہو؟" پہلی عورت دانت پیس کر بولی

میں نے کہا "جب دو جانور لڑتے ہیں تو گھڑے ٹوٹ جاتے ہیں"

وُہ بولی "جانور تم ہو، سوّر . . . ایک تو باؤلی خراب کر دی، خچر کو پانی پلا کر، پھر ہمارے گھڑے . . . ! اور اب باتیں بناتے ہو، پیسے نکالو، نہیں تو"

"نہیں تو کیا ہو گا؟" میں نے پوچھا

"میں تمہارا خچر لے جاؤں گی؟" یہ کہہ کر وہ خچر کی طرف لپکی اور پیشتر اس کے کہ میں اسے روک سکوں۔ وہ اس کی پیٹھ پر چڑھ کر بھاگ گئی، مرجانہ خچر کے ساتھ دوڑنے لگی اور میں دونوں کے پیچھے بندوق اُٹھائے، جی میں آیا کہ فائر کر دوں، اس قدر تاؤ آ رہا تھا مجھے، مگر کیا کرتا عورت ذات پر ہاتھ کیسے اُٹھاتا۔

اے۔ سنو تو ۔۔۔ سنو تو ۔۔۔ خدا کی قسم . . . یہ لو پیسے، ٹھہر تو جاؤ خدا کی قسم، مجھے آج رنگپور جانا ہے۔"

مگر اس حرامزادی نے نہ سنا، خچر بھی جو پہلے ایک قدم نہ اُٹھا سکتا تھا۔ اب گھاٹی پر لڑھکتے ہوئے پتھر کی طرح تیزی سے جا رہا تھا، مرجانہ ہرنی کی طرح سبک گام تھی دوسری عورت مڑ مڑ کر میری طرف دیکھتی جاتی اور ہنستی جاتی۔ ٹھہر تو سہی، سور کی بچی، آج ہی رات تجھ سے بیاہ نہ کیا تو شاہ زماں نام نہیں۔ میں جھاڑیوں پر سے کودتا، پھلانگتا، ندی کے کنارے کنارے بھاگا جا رہا تھا۔ اگر دونالی اور کارتوسوں کا بوجھ نہ ہوتا تو کب کا انہیں جا لیا ہوتا۔ آخر دوڑتے دوڑتے میرا دم پھول گیا، میں رُک گیا اور چلا کر کہنے لگا . . . "ٹھہر جا . . . . اے ڈاکو کی بیٹی . . . . رہزن خچر! ورنہ ابھی فائر کرتا ہوں، مگر کمبخت نے یہ دھمکی

مُڑ کر بھی نہ دیکھا۔ وہ اسی طرح خچر کو ایڑ لگاتی دوڑاتی چلی گئی، دوڑاتی چلی گئی اور بھگاتی چلی گئی اور ہر نقش پا کو مٹاتی چلی گئی اور میں وہیں ایک ٹیلے پر کھڑا ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ وہ گھاٹی کے نیچے جا رہی تھیں۔ جہاں ندی ایک چھوٹی سی وادی میں بہتی تھی، جہاں ایک چھوٹا سا مرغزار تھا اور سبز تلے پر تین چار خیمے کھڑے تھے۔ خیمے، یہ خیمے تو خانہ بدوشوں کے سوا اور کسی کے نہیں ہو سکتے، ان میں آگ روشن تھی اور ہلکا ہلکا لطیف سا دھواں سبز تلے کی سطح سے اُٹھتا ہوا آسمان کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں بادلوں کا رنگ گلابی سے عنابی اور عنابی سے شہابی ہو چکا تھا اور تاروں کے کنول کھلتے جا رہے تھے . . . . مرجانہ اور خچر پر بیٹھی ہوئی عورت کو میں نے ان خیموں کے پاس اترتے دیکھا اور پھر وہ دونوں ایک خیمے میں گھس گئیں، خچر باہر چرنے لگا، تھوڑی دیر میں ایک آدمی خیمے سے باہر نکلا، اُس نے اپنے ہاتھ اپنی کنپٹیوں کے پاس لے جا کر وہیں دور سے میری طرف دیکھا اور پھر خچر کو ایک خیمے سے باندھ کر اندر چلا گیا۔ میں نے سوچا، لو اب ان خانہ بدوشوں سے اُلجھنا پڑ گیا۔ پھر خیال آیا۔ کیوں نہ اپنے ماموں اللہ داد خاں سے امداد طلب کروں۔ پھر سوچا میرے بوٹے میں ہرکاری لگان کے پیسے ہیں۔ کہیں اسے پتہ چل گیا تو وہ ڈاکو تو ہے ہی

کہیں مجھ پر بات صاف نہ کر دے، اب تو اکیلے ہی ان خانہ بدوشوں سے نبٹنا پڑیگا خیر یہ تو اپلو بور انہیں ڈرانے کے لئے کافی ہوگی۔ یہ سوچ کر میں نیچے اُترنے لگا۔ جلدی جلدی، کیونکہ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ شفق کے گُم ہوتے ہی تاریکی گویا پہاڑوں کی چوٹیوں سے اُبل پڑی اور ساری وادی میں پھیلتی گئی۔ جب میں نیچے مرغزار میں پہنچا ہوں تو چاروں طرف اندھیرا چھا گیا، ہاں خیموں میں آگ روشن تھی اور پرے ایک درخت سے بندھا ہوا میرا خچر کھڑا تھا۔ میری طرف کس بیکسی سے دیکھ رہا تھا۔ گھبراؤ نہیں میرے محبوب، میں تجھے ان ظالموں کے چنگل سے آزاد کرتا ہوں۔

میں آگے بڑھا۔ کسی نے پکارا "کون ہے؟"

"میں ہوں ایک آدمی"

"آدمی کہ جانور" وہ کمبخت پھر بول پڑی۔ اب دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھے بڑے ٹھسے سے کھڑی تھی اور خیمے کا پردہ ہوا میں ہل رہا تھا اور شعلوں کی لپک اُس کے رخساروں پر ناچ رہی تھی۔

"شمع تم اندر چلو" اس آدمی نے کہا "میں اس سے خود نبٹ لونگا"

میں نے کہا "میں لڑائی جھگڑا کرنے نہیں آیا۔ تمہاری بیوی میرا خچر

چرا لائی ہے۔ وہ مجھے دے دو۔"

وہ بولا۔ "میری بہن کو میری بیوی نہ کہو ماہی!"

میں نے کہا: "وہ جو کوئی بھی ہے تمہاری بہن یا بیوی یا ماں، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں، مجھے اپنا خچر چاہیئے۔"

"میں تمہاری ماں ہوں سور نی کے جنے!" وہ پھر چیخی اور خیمے کے باہر آن کر کھڑی ہو گئی۔

"تم چپ رہو شمع، مجھے اس اجنبی سے بات کرنے دو۔"

وہ اندر چلی گئی، آدمی کہنے لگا، "تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"رنگپور"

"تمہارا نام؟"

"شاہ زماں۔"

"کیا کرتے ہو؟"

"میں؟ —— میں نمبر دار کا بیٹا ہوں۔"

"میں پوچھتا ہوں تم کیا کرتے ہو، تم کہتے ہو، میں نمبر دار کا بیٹا ہوں۔"

میں نے کہا: "میں —— شکار کھیلتا ہوں، عشق کرتا ہوں، کبھی کبھی اپنے

باپ کے لیئے دیہات سے لگان وصول کرتا ہوں۔"

"اچھا اب لاؤ میرا خچر۔" . . . . . یہ کہہ کر اپنے خچر کی طرف بڑھا . . .

وُہ بولا۔" ہم دو تین دن میں رنگ پور آنے والے ہیں۔ وہاں کھیتوں میں کام ملیگا؟"

میں نے کہا۔" تم خانہ بدوش بڑے کام چور ہوتے ہو کام سے جی چراتے ہو دن بھر آوارہ گردی کرتے رہتے ہو یا کسانوں کی بھیڑ بکریاں چراتے رہتے ہو اور جب گاؤں سے چلے جاتے ہو تو پتہ چلتا ہے کہ فلاں کسان کے ہاں سے ہل چوری ہو گیا، فلاں کے گھر سے مُرغیاں غائب ہیں۔ اس کی بکری نہیں ملتی اور اس کا گدھا۔"

وُہ بولا۔" یہ تو معمولی سی بات ہے، تم لوگ زمین کے بادشاہ ہو۔ اِن چھوٹی چھوٹی باتوں پر تمہارا دھیان نہ جائے تو اچھا ہے۔" اُس کے لہجے میں بھی لجاجت تھی۔" ہمیں کام کی بڑی ضرورت ہے۔"

"چمن کوٹ تمہیں پسند نہیں؟"

"جگہ اچھی ہے مگر ڈاکوؤں کی بستی ہے اور اللہ داد ہمیں بہت ڈراتا دھمکاتا ہے۔ اگر یہاں رہے تو کسی دن خون خرابہ ہو جائے گا۔ یکایک اُس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ میں نے دیکھا اس کے ہاتھ میں ایک بندوق ہے۔

وہ بولا "تم اپنا خچر لے جاؤ۔ میری بہن تو بیوقوف ہے، بھلا راہیوں سے کون اُلجھتا ہے، وہ بھی تو ہماری طرح خانہ بدوش ہوتے ہیں۔ گو وقتی طور پر سہی"
. . . وہ ہنسا اُس کی ہنسی بڑی دلکش تھی

قریب کے ایک خیمے کے اندر میں ایک بڑھیا، ایک جوان عورت، دو بچوں اور ایک ادھیڑ عمر کے خانہ بدوش کو دیکھ سکتا تھا۔ سب لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ بڑھیا بار بار ہانڈی میں لکڑی کا چمچہ ڈال کر شوربہ نکالتی تھی اور سب کو تقسیم کرتی جاتی تھی۔ خوشبو اُڑ اُڑ کر نتھنوں میں آرہی تھی

اُس کی نگاہ نے میری نگاہ کا تعاقب کیا۔ پھر میری طبعیت کا اندازہ کر کے بولا۔ "تو آؤ، آج رات یہیں رہو۔ آگے خطرناک جنگل بھی ہے۔ اکیلے کیسے جاؤ گے"

"اکیلا تو نہیں ہوں۔ یہ دونالی میرے ساتھ ہے" میں نے کہا۔

"اس دونالی پر تمہیں بڑا گھمنڈ ہے۔ اسے پہلا بھی لیتے ہو" پھر وہ ہنسا اُس کی ہنسی بڑی دلکش تھی۔ میں نے اس کے لہجے کی طنز کو معاف کر دیا اور چپ چاپ اُس کے خیمے میں داخل ہو گیا۔

چولھا زمین کھود کر بنایا گیا تھا۔ اُس پر ہانڈی اُبل رہی تھی۔ مرجانہ پاس بیٹھی چمچے پھیر رہی تھی اور آنچ مدھم کرتی جاتی تھی۔ شمع سر جھکائے مکّی کا آٹا گوندھ

رہی تھی۔ دئیوں کی روشنی اُس کے رُخسار پر اُس کے بالوں پر پڑ رہی تھی۔ مرجانہ کی آنکھیں حیران تھیں تو شمع کی مجوب۔ دھیان فرش پر بچھا ہوا تھا جس سے پرانے دھان کی بُو آتی تھی۔ یہ خیمہ جو گندے چیتھڑوں، رنگارنگ کپڑوں کے ٹکڑوں اور گندم کے خوشوں سے بنا ہوا تھا۔ دیکھنے میں سُبک لیکن بڑا مضبوط تھا، تانت کی سلائی تھی۔ ایک کونے میں دو گٹھڑیاں تھیں۔ ایک بکری بندھی تھی جس کے تھنوں پر ایک میلا سا کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ ایک کھُردرے بالوں والا کتا مجھے اندر آتا دیکھ کر غرّانے لگا: "چپ بے ظالم"۔ مرد کی آواز نے اسے خاموش کردیا۔ اس کتے کے بالوں کا رنگ فولادی تھا اور آنکھیں سُرخ اچھا نام پایا تھا "ظالم"۔

مَیں نے اس آدمی سے کہا: "اور تمہارا نام کیا ہے؟"

وُہ بولا: "مجھے خداداد کہتے ہیں"۔

میں نے کہا: "تم اپنی بہن کی شادی کیوں نہیں کرتے جب تلک یہ اپنے خاوند سے پٹے گی نہیں درست نہیں ہو گی"۔

وُہ ہنسنے لگا: "کوئی ایسا خاوند بھی تو ملے جو اسے درست کرسکے"۔

میں نے کہا: "مجھے بیاہ دو اس سورنی کو۔ مار مار کر کھال نہ ادھیڑ دوں

تو شاہ زماں۔ . . .

شمع بجلی کی طرح لپک کر اُٹھی اور اپنے بھائی سے بندوق چھین کر بولی "ہاتھ لگا کر تو دیکھو۔ راہی ہو اس لیئے جان بخشتی ہوں کوئی دوسرا ہوتا تو چھرا اس کے کلیجے سے پار ہوتا"

خداداد مسکرا کر کہنے لگا "شمع سچ کہتی ہے، اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا"

"اس کے تو ہم بھی قائل ہیں" میں نے آہ بھر کر کہا اور وہ تیزی سے مڑ گئی۔ اور مرجانہ کے پاس جاکر بیٹھ گئی۔ مرجان کی بڑی بڑی حیران نگاہیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔ شمع اپنے ہونٹ چبا رہی تھی۔ وہ پھر لکڑی کے پرات کے پاس جاکر بیٹھ گئی اور مکی کا آٹا گوندھ کر ٹوڈھے پکانے لگی، نرم نرم گرم گرم ٹوڈھے جو چولھے میں سینکے جا رہے تھے اور جن سے تازہ مکی کے بھٹوں کی خوشبو آتی تھی سامنے کے خیمے میں ایک لڑکا رو رہا تھا اور اُس کی ماں اسے گالیاں دے رہی تھی اور اس کا باپ پاؤں چرخی چلا کر چقماق پہ اُون کترنے کی قینچی تیز کر رہا تھا "چپ ہو جا شیطان کی اولاد، نہیں تو یہی قینچی تیرے سینے میں بھونک دونگا"

لڑکا روتے روتے کہنے لگا "شیطان کی اولاد تو ہے ابا"

باپ مسکرانے لگا اور اپنے انگوٹھے پر پھل کی دھار کا اندازہ کرنے لگا

پھر اُس نے زور سے چرخی گھمائی اور قینچی کے ایک پھل کو چقماق پر رکھدیا۔ شرارے کی اک پھلجھڑی سی تاریکی میں چھوٹتی گئی . . . . .

"خداداد!"

"کون ہے ـــــ راول؟"

"ہاں!"

"کیا کہتے ہو راول؟"

"بھئی، آج خیمے سے باہر نہیں آؤ گے؟ ایسی عمدہ چاندنی کھلی ہے!"

ہم لوگ خیمے کا پردہ بند کئے رسی بٹ رہے تھے۔ میں اور مرجانہ سن کے خوشوں کو نرم کر کے رسی میں لگاتے جاتے تھے۔ شمع نے رسی کے ایک سرے کو اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے دبا رکھا تھا۔ دوسری طرف سے خداداد بٹتا جاتا تھا۔ لیکن کیا مجال جو شمع کے پاؤں میں ذرا بھی لغزش پیدا ہو جائے، ہاں اس کے رخساروں کا رنگ گہرا سرخ ہو گیا تھا اور پلکیں بوجھل ہو کر گری پڑتی تھیں۔ وہ انہیں باربار سنبھالتی لیکن اب نظر نہ ملا سکتی تھی۔ ستواں ناک کے نیچے غنچہ دہن نیم وا تھا، اور اس کا سانس تیز تھا اور وہ کبھی کبھی اپنی پتلی سی سرخ زبان نکال کر اپنے لبوں پر پھیر لیتی، اس کی یہ ادا مجھے بہت پسند آئی۔

راول کے بلانے پر خداداد اٹھا اور خیمے کا پردہ کھول کر باہر کھڑا ہو گیا پھر اس نے اک زور کا سانس لیا جیسے کھلی ہوئی چاندنی کو سونگھ رہا ہو۔ شمع اس طرح بیٹھی تھی کہ جب خیمے کا پردہ ہٹا تو چاندنی کا طوفان یکلخت اس کے رُخ سے ٹکرایا اور پھر وہاں سے اُچھلتا ہوا دھیال کے خوشوں پر سے پھسلتا ہوا، خیمے کے دوسرے کونے تک چلا گیا۔ جہاں وُہ بکری بندھی تھی۔ شمع کا زتیونی حُسن شفاف مرمر میں مبدل ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں جھپک گیئں اور مجھے گویا اسکی بند پلکوں کے اندر سیاہ پتلیوں میں چاندنی کی شعاعیں کانپتی ہوئی نظر آئیں۔ چاندنی جوانی اور کچھ شاید نگاہوں کی فتنہ سامانی تھی کہ مجھے اس وقت شمع کے چہرے پر ایک بلوریں کیفیت کی تابانی نظر آئی۔ دوسرے لمحے میں خداداد کی آواز نے یہ احساس زائل کر دیا۔ وُہ کہہ رہا تھا "شاہ زماں —— چلو —— باہر آجاؤ —— شمع —— مرجانہ"۔۔۔

شمع اپنے بھائی کی توڑے دار بندوق اور میری ٹوابلو ور اُٹھائے ہوئے باہر نکلی۔ میں نے پوچھا تو بولی "تیرے گھمنڈ کا امتحان لینا چاہتی ہوں۔

باہر راول کھڑا تھا، چھ فٹ قد، ننگے پاؤں، گھیرے دار شلوار جو صرف گھٹنوں تک آتی تھی۔ گھٹنوں کے نیچے ٹانگیں بالکل ننگی تھیں اور ران پر زخموں کے نشان

تھے۔ لمبے لمبے بال سر پہ رکھ چھوڑے تھے اور ان پر اس نے بغدادی چور کی طرح ایک رومال باندھ رکھا تھا۔ دائیں کان میں اک لوہے کی بالی تھی، خانہ بدوش نہیں کسی فلم کا ہیرو معلوم ہو رہا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا، پھر اس کی نگاہیں شمع کے چہرے پر گڑ گئیں۔

راول بولا: "خداداد کہتا ہے تمہارے پاس انگریزی بندوق ہے۔"

"ہاں، یہ دیکھو، راہی کی بندوق!" شمع چہکی

راول اسے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا: "یہ کیسی بندوق ہے۔ اس کی ایک نالی میں دندانے ہیں، دوسری نال بالکل صاف ہے، ہماری توڑے دار بندوقوں کی طرح"۔

میں نے کہا: "دندانے دار نال میں بڑے شکار کے لئے گولی ڈالتا ہوں سیدھی نال سے تیتر کا شکار کرتا ہوں۔ یہ —— گولی والا کارتوس ہے —— یہ چھرے دار۔ . . . دیکھو —— یہ ہے . . .!"

راول بولا: "انگریزی رائفل اچھی ہوتی ہے مگر ہماری توڑے دار کا مقابلہ نہیں کر سکتی"۔

شمع بولی: "بندوق اچھی یا بری نہیں ہوتی۔ یہ تو جوان کا ہاتھ ہوتا ہے"۔

راول ہنسنے لگا۔ مجھے اس کی ہنسی مصری کی طرح معلوم ہوئی۔ مَیں نے کہا "جوان کے ہاتھ بھی دیکھ لو، کون منع کرتا ہے۔"

راول آگے بڑھا۔ خداداد کا چہرہ بالکل سنجیدہ تھا۔ راول میرے قریب آ رہا تھا۔ خداداد نے آہستہ سے کہا "شاہ زمان ہمارا مہمان ہے۔"

راول رُکا۔ پھر پیچھے ہٹ گیا

خداداد نے کہا "وہ سامنے دیکھو۔ دیودار کی پھنگل۔ وہ ہمارا نشانہ ہے۔"

چاندنی رات میں دیودار کی وہ پھنگل، ایک صلیب کی طرح آسمان کی طرف اُٹھتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

شمع نے بندوق میرے ہاتھ میں تھما دی اور کہا "تم ہمارے مہمان ہو، پہلے تمہارا حق ہے۔"

اس کے لہجے کی خفتہ طنز سے میں جھلّا گیا۔ میں نے شست باندھ کر بندوق چلائی مگر میں جانتا تھا کہ میں چوک جاؤں گا۔ وہ پھنگل وہیں کھڑی تھی۔

خداداد نے اپنی نگاہوں سے ایک بار اس پھنگل کا جائزہ لیا اور پھر بندوق سیدھی کر کے لبلبی دبائی۔ ٹھائیں۔

مگر پھنگل وہیں کھڑی تھی۔ راول ہنسنے لگا۔

اب راول نے اِک عجب بے اعتنائی سے اپنی بندوق ہاتھ میں لی اور اس طرح بندوق چلائی کہ سامنے دیودار کی بلبل تو کیا اگر عنقا کا پر ہوتا تو وُہ بھی چھد جاتا لیکن بلبل وہیں کھڑی تھی۔ اک صلیب کی طرح آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی شمع نے جھلّا کر بندوق راول کے ہات سے چھین لی اور بولی: "آج تمہیں ہو کیا گیا ہے۔" اور یہ کہکر اُس نے نال میں توڑا ڈال کر بھرا اور پھر بٹھائیں . . .

بلبل غائب تھی، شمع نے بندوق کا دہانہ اپنے ہونٹوں سے لگا کر پھُونکا اور پھر بندوق کو راول کے ہات میں دے دیا۔ راول کے ہات ایک لمحے کیلئے شمع کی اُنگلیوں پر سختی سے جم گئے۔ پھر شمع نے فوراً ہاتھ چھڑا لیا، بندوق زمین پر جا گری۔ راول ہنس کر مجھ سے کہنے لگا: "پنجہ پکڑتے ہو جوان!"

"کیوں نہیں۔ لاؤ ہات!"

پھر ہم پنجہ پکڑنے لگے۔ یہ خانہ بدوش نہیں جانتے تھے کہ میں پنجہ پکڑنے میں کس قدر مشّاق ہوں، بہت جلد میں نے خداداد کو مات دیدی۔ پھر راول سے قوت آزمائی ہوئی، پنجہ چھڑاتے ہوئے میں نے اسے وُہ جھٹکا دیا کہ وُہ دس گز پرے جا گرا اور مرجانہ تالی بجا کر ہنسنے لگی، شمع نے غصّے میں آ کر مرجانہ کے تھپڑ مارا اور وُہ رونے لگی۔

میں نے شمع سے کہا "مرجانہ نے تمہارا کیا بگاڑا ہے"۔

وہ بولی "تم چپ رہو جی۔ بڑے مرجانہ کے حمایتی بن کے آئے ہیں ایک رات کا مہمان اور ابھی سے کیسی باتیں کرتا ہے، جیسے خانہ بدوشوں کا بھی سردار ہے۔ ایک راول سے بنی کیا چھپڑالی۔ آفت آگئی"۔

خداداد ہنسنے لگا، اتنے میں سامنے کے خیمے میں جو خانہ بدوش قینچی تیز کر رہا تھا۔ اس نے اب چرخی اور چقماق اٹھا کر الگ رکھ دیئے اور دف بجا کر گانے لگا۔ اس کی بیوی اور بچے بھی اس کے ساتھ مل کر گانے لگے ہم سب لوگ، وہیں چلے گئے۔ راول کے خیمے کے لوگ بھی اٹھ کر وہاں چلے آئے اور چوتھے خیمے کے افراد بھی کہ صرف ایک بوڑھا اور بڑھیا تھے، الاؤ میں دو بڑے بڑے سوکھے ٹھڈ جل رہے تھے اور ان کی خوشگوار آگ کا پرتو ہر چیز پر تھا اور پس منظر میں بکری کا رباب بج رہا تھا، ہلکا، مدھم، شیریں، اور خانہ بدوشوں کی آوازیں چاندنی رات میں گھلتی ہوئی، گونجتی ہوئی سلسلہ ہائے کوہ تک پھیلتی جا رہی تھیں۔ اک چاندنی کا طوفان تھا، اک نشے کا طوفان تھا اور تاروں کی سبک اندام سندر کشتیاں جھلمل جھلمل کرتی ہوئی تیر رہی تھیں اور اب شمع کے پاؤں ناچ رہے تھے اور اس کا جسم اس کی روح میں گھل گیا

تھا اور اب وُہ ہمارے حلقے میں، ہمارے حلقے سے باہر، یہاں وہاں، زمین پر آسمان پر، ہر جگہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کی آواز زمین کی آواز تھی۔ ازلی، وحشی، ناقابل تسخیر، اس کا رقص، کائنات کا رقص مسلسل، پیہم، مضطرب، غیر مختتم، اس کے بال اڑ اڑ کر اُس کے رخساروں پر پڑ رہے تھے اور جب رقص کی دوسری گردش میں وُہ انہیں جھٹک دیتی، تو اک بجلی سی کوند جاتی۔ تاریکی، بجلی، آواز اور گردش جیسے ساتوں آسمانوں کے سورج، چاند اور تارے سنبھل گئے تھے اور راگ ہیولے کی صورت میں زمین پر ناچ رہے تھے جیسے تخلیق اور قیامت، زندگی اور موت خدا اور انسان ایک ہی پیکر میں ضم ہو کر ہنگامۂ آفرینش کی ابتدا کر رہے تھے اور ناچ ناچ کر کہہ رہے تھے، دیکھو، دیکھو، یہ ہے وُہ عورت، وُہ شمع، وہ نور کی مشعل جو اپنے رحم کے مندر میں دیوتاؤں اور انسانوں کو پیدا کرتی ہے، اُن کی تہذیب و تمدن کو بقا دیتی ہے، ان کے سینوں میں سرچشمۂ علم و اخلاق کو فروزاں کرتی ہے۔ ازل سے ابد تک، یہ وہی عورت ہے، وحشی، شعلہ، طوفان، رقصاں حیات کا مرکزی بھنور! . . . . .

ناچ اور نغمے کی یہ محفل شاید صبح تک جاری رہتی۔ اگر میرا ماموں

اللہ داد خاں آکر رنگ میں بھنگ نہ کر دیتا۔ یکایک وہ اس محفل میں آکر چیخنے لگا: "ابے حرامزادو، خانہ بدوشو، اٹھاؤ یہاں سے اپنا بھنگ بھوسڑا اور نکل جاؤ ہمارے گاؤں سے ابھی۔ اسی دم، ورنہ۔" . . . شمع ناچتے ناچتے اک دم بیٹھ گئی اور ہانپتے ہوئے وہ اپنے بھائی کی طرف دیکھنے لگی۔ راول اور خدادام دونوں فوراً اللہ داد خاں کی طرف بڑھے، لیکن اس کے ہات میں پستول دیکھ کر وہیں کھڑے رہ گئے۔

راول بولا: "ہم خانہ بدوش ہیں، ہم کسی کی ہیکڑی برداشت نہیں کر سکتے اس آسمان کے نیچے جتنی زمین ہے ہماری ہے، ہم —— جہاں جی چاہے گا ہمارا —— رہیں گے، جب جی چاہے گا اٹھ کر چلے جائیں گے۔"

اللہ داد خاں پستہ قد گٹھیلے بدن کا ڈاکو تھا۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں، چھوٹی چھوٹی آنکھیں جو اپنے گڑھوں میں قمقموں کی طرح چمکتی تھیں۔ اس کے جثے سے کسرت اور پھرتی اور چالاکی کا اظہار ہوتا تھا اور بے رحمی کا بھی . . . پستول اس نے راول کے سینے پر باندھ رکھا تھا، کہنے لگا: "یہ رنگ پور کا گاؤں نہیں ہے یہاں ہیجڑے نہیں بستے، یہ اللہ داد خاں کا گاؤں ہے، ایک کھوہ میں دو شیر نہیں رہ سکتے، چپ چاپ نکل چلے جاؤ یہاں سے، ورنہ خیمے تک جلوا دوں گا۔"

میں نے غصے میں آکر خداداد کو پیچھے دھکیل دیا اور اللہ داد کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

میں نے کہا۔" ماموں ان غریب خانہ بدوشوں سے کیوں لڑتا ہے اگر لڑنا ہے تو میرے ساتھ لڑ، رنگپور والے ہیجڑے ہیں تو آ۔ میں مقابلے کے لئے تیار ہوں"۔

وہ مجھے دیکھ کر حیران ہو گیا۔" ارے تو —— شاہ زماں —— یہاں کیا کر رہا ہے، ان جنگلیوں کے خیمے میں، اپنے گھر کیوں نہیں آیا؟"

پھر شمع اور مرجانہ کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔" اب یہ خیمے ضرور جلانے پڑیں گے۔ گاؤں کے سارے جوان مرمٹے ان خانہ بدوش عورتوں پر۔۔۔۔"

راول آگے بڑھا، اللہ داد نے پستول تھوڑا سا اور آگے بڑھا دیا خداداد نے راول کو روک دیا۔ پھر نہایت شیریں لہجے میں بولا۔" اللہ داد خاں کل شام کو ہم یہاں سے چلے جائیں گے، بس اتنی مہلت اور دے دو"۔

" اچھا۔ کل شام کو ضرور چلے جائیو۔ اگر میں نے تمہیں یہاں دیکھا تو گاؤں کے کتوں سے تمہیں پھڑوا ڈالوں گا"۔ پھر میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا

" گھر چلتے ہو؟"

مَیں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"کہاں سے آرہے ہو، لگان وصول کر کے؟ بٹوا تو آج بہت بھاری ہوگا۔" اس کی تیز آنکھیں چمکنے لگیں۔

مَیں چُپ ہو رہا۔ راول اور خداداد نے میری طرف دیکھا۔ پھر اللہ داد خاں نے اُن دونوں کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ "یہ شاہ زماں بڑا ہوشیار لونڈا ہے۔" اللہ داد نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔ "اچھا تو میں چلتا ہوں، صبح مجھ سے مل کر جائیو یہاں سے......!"

راول اور خداداد دونوں اللہ داد خاں کو کشتی کے اس پار پہنچانے کے لئے گئے۔ بہت دیر کے بعد لوٹے، وہ ابھی پلٹے نہ تھے کہ میں نے اپنی تجویز پختہ کر لی۔ مَیں نے اپنا بٹوا اُٹھا کر شمع کے سامنے پھینک دیا اور اس سے کہا۔ "صبح تم سے لے لوں گا۔"

وہ بٹوا دیکھ کر مسکرائی، بولی "میں اسے پاس نہیں رکھتی۔ یہ تمہارا مال ہے اس کی حفاظت کرنا تمہارا کام ہے۔"

مَیں نے کہا۔ "میں تمہارا مہمان ہوں۔"

شمع نے کہا۔ "میں نے تمہیں نہیں بلایا تھا۔"

"ڈرتی ہو؟"

اُس نے بٹوا میرے ہاتھ سے چھین لیا، چمک کر بولی: "مرد اپنی بندوق، اپنے خیمے اور اپنی عورت کی خود حفاظت کرتا ہے۔ لیکن تم مٹی کے گھروں میں رہنے والے ہیجڑے ان باتوں کو کیا جانو.....؟"

مَیں نے دونالی اپنے سرہانے رکھ لی اور دھیال پر دراز ہو گیا: "کیے جاؤ" میں نے کہا۔ "مجھے تو نیند آ رہی ہے۔" اور یہ کہہ کر میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

بہت دیر کے بعد راول اور خداداد، اللہ داد خاں کو پہنچا کر لوٹے اور دیر تک خیمے کے باہر سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ مَیں بظاہر سو رہا تھا لیکن دراصل اُن کی ہر ایک بات سُن رہا تھا۔ میرا ہاتھ اپنی دونالی پر تھا۔ وُہ دونوں شمع کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے اور شمع کہہ رہی تھی کہ وُہ اب کُچھ نہ کر سکتی تھی وُہ قول ہار چکی تھی۔ راول اسے گالیاں دینے لگا اور شمع اسے ..... پھر خداداد نے کہا: "کیوں نہ ہم اسے جان سے مار ڈالیں اور جنگل میں جا کر گاڑ دیں۔" لیکن شمع نے نہ مانا۔ اس نے کہا۔ "اللہ داد کا کیا بھروسہ، وُہ کل کو تمہیں بھی پھانسی پر چڑھا دے گا۔ بھلا خانہ بدوش بھی قتل کرتے ہیں کہیں؟ چوری، ڈکیتی تو خیر الگ بات ہے۔ لیکن قتل تو خانہ بدوشوں نے آج تک

کبھی نہیں کیا۔ پھر کیا اپنے خاندان کو بٹہ لگاؤ گے؟" آخر زادل اور خداداد کو شمع کی بات ماننا پڑی۔

خداداد اور شمع نے خیمے میں آ کر آگ بجھادی اور دھیال پر آ کر سو رہے مرجانہ پہلے ہی سے محوِ خواب تھی۔ شمع بھی اس کے قریب آ کر لیٹ گئی۔ خداداد میرے قریب آ کر لیٹ گیا۔ اب مَیں شمع اور خداداد کے درمیان سو رہا تھا۔ خیمے کا دروازہ کسی نے بند نہ کیا تھا اور پردہ ہوا کے تیز جھونکوں سے پھڑپھڑا رہا تھا اور چاندنی کی کرنیں دھیال پر پھیلتی ہوئی آ رہی تھیں۔ "ظالم" دروازے پر چوکنا کھڑا تھا اور نتھنے اونچے کئے فضا میں کسی موہوم دشمن کو سونگھ رہا تھا۔ خفیف سی آہٹ پا کر وہ بھونکنے لگتا۔ میں دم سادھے جاگ رہا تھا۔ ایک طرف شمع تھی، تو دوسری طرف خداداد سو رہا تھا۔ وہ بہت جلد سو گیا اور خراٹے لینے لگا، یہ نقلی خراٹے نہ تھے۔ میں نے کروٹ بدل کر شمع کی جانب دیکھا۔ چاندنی کا ہالہ اُس کے رُخ پر اور اس کے بل کھائے ہوئے بالوں کے گرد تھا اور اُس کی خمیدہ ٹھوڑی کے نیچے اُس کا بایاں ہاتھ مس ہو رہا تھا وُہ میرے اس قدر قریب لیٹی تھی کہ میں ہاتھ پھیلا کر اُس کی ٹھوڑی کو چھو سکتا تھا۔ اس کی ٹھوڑی کو چھو لینے، اس کے رخساروں کو چوم لینے اور اس کے

سارے جسم کو لے کر اپنی آغوش میں کچل دینے کا طوفانی جذبہ میرے دل میں گونجنے لگا۔ میں جسم کی آواز نہ سننا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں۔ لیکن یہ گونج تو گویا دل کی تیز دھڑکن اور دوران خون کا تموج بن گئی تھی جسم کے ذرے ذرے سے ایک ہی آواز آ رہی تھی۔ شمع کو کچل ڈالو، شمع کو کچل ڈالو۔ . . . میں آہستہ سے اس کے قریب سرک گیا اور پھر مڑ کر خداداد کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ گھوک سو رہا تھا اور خراٹے لے رہا تھا، ہلکے ہلکے . . . .
میں نے اپنا ہاتھ شمع کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں پر رکھ دیا۔ کوئی جنبش پیدا نہ ہوئی۔ دیر تک میرا جلتا ہوا گرم ہات اس کی خنک برفانی انگلیوں پر پڑا رہا کوئی جنبش پیدا نہ ہوئی۔ پھر آہستہ سے میں نے اس کی خمیدہ ٹھوڑی کو چھوا اور میری رگوں اور نسوں میں لاکھوں شعلے تڑپنے لگے اور طوفانی لہروں کے ریلے اچھل اچھل کر ساحل حیات سے ٹکرانے لگے۔ کانوں میں ایک ہی نغمہ تھا ایک ہی مسلسل گونج تھی، شمع کو کچل ڈالو، شمع کو کچل ڈالو۔ میں نے ایک نظر پھر خداداد کی طرف ڈالی۔ پھر مرجانہ کی طرف جو بدستور کروٹ بدل کر سو رہی تھی۔ پھر میں شمع کی جانب اور کھسک گیا۔ دھیان پر اک ہلکی سی سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ یہ سرسراہٹ جو اک میٹھی سرگوشی تھی۔ اک نغمہ راز تھی، مسرت کی نقرئی

لہر تھی اور میں اس کے بہاؤ میں تیرتا ہوا شمع کے بالکل قریب چلا گیا پھر میں نے اپنے ہات کی انگلیوں کو اس کے ہات کی انگلیوں میں ڈال کر انہیں زور سے دبایا۔ جاگ.... جاگ.... اے شمع شبستانِ وصال!....

شمع جاگی نہیں۔ اس کی آنکھیں بدستور بند رہیں، لیکن میرے ہات کی انگلیوں کا آہنی لمس اسی طرح محسوس کیا کہ اگر میں مرد نہ ہوتا تو شدّتِ درد سے بلبلا اٹھتا۔ وہ آہستہ آہستہ میری انگلیوں کو مروڑ رہی تھی۔ خاموشی سے، ہلے چلے بغیر، آنکھیں کھولے بغیر، مجھ سے کچھ بات کئے بغیر ہی وہ میرے ہات کی انگلیوں کو اک آہنی شکنجے میں کس کر مروڑ رہی تھی اور میں مدافعت کرتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ انگلیوں میں اتنی طاقت، اتنی قوت، اتنی توانائی کہاں سے آگئی۔ اس پھول کے سے جسم میں فولاد کی سختی کہاں چھپی ہوئی تھی۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ اپنا ہات اس کی گرفت سے چھڑا لوں۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر جب درد حد سے بڑھ گیا تو میں دوسری کروٹ بدلنے پر مجبور ہو گیا۔ اب میری پیٹھ اس کی طرف تھی اور میرا ہات اس کے ہات کی انگلیوں میں جکڑا ہوا تھا۔

شمع نے سرگوشی میں کہا: "بینی پکڑ دگے ؟"

میں نے کہا "تم عورت نہیں ہو۔ چڑیل ہو!"

وہ آہستہ سے ہنسی، بولی "اور شکنجہ!"

میں نے کہا "دیوتی کی اولاد ہو۔ سورنی!"

اُس نے کہا "ماہیا سنو گے؟"

میں نے کہا "میرا ہات چھوڑ دو، تمہاری سات پشتوں پر لعنت!"

وہ بولی "مجھے ماہیا سے عشق ہے، جب گھاٹیوں میں اس کی آواز گونجتی ہے۔ ہاہاہا"

"چپ ہو جاؤ" میں نے کہا "خدا کے لئے۔ اگر کوئی سن لے گا تو ـــــ"

"میں کسی سے ڈرتی نہیں ہوں، . . . . . اچھا تو ماہیا سنو اور وہ دھیمے بہت ہی دھیمے سروں میں گانے لگی، اُس کی آواز میں ہنسی، شوخی اور شرارت کے سُر ملے ہوئے تھے۔

بازار وکندی پٹّی . . . . بازار وکندی پٹّی
نڈھی مار گئی پلیٹی
نڈھا کمزور دے جی دے جانی۔ پہاڑ رد گھیلے آویں
تہاری مہربانی

"حرامزادی!" میں نے غصے سے کہا اور اُس نے اس پر میرے ہات کی اُنگلیوں کو ایک اور بل دیا۔ کہنے لگی: "شمع خانہ بدوش کی لڑکی ہے۔ وُہ کسی مٹی کے گھر میں رہنے والے کسان کی لڑکی نہیں ہے جو نمبردار کے لڑکے کو دیکھ کر اس پہ عاشق ہو جائے گی اور اپنی زندگی کی ساری دولت چُپ چاپ اس کے حوالے کر دے گی، تم مہذب لوگ جنگلیوں کے اخلاق کیا جانو...!"

یہ کہہ کر اُس نے میری اُنگلیوں کو پھر شکنجے میں کسا۔ اُف! شدت کا درد تھا اور بڑھتا جا رہا تھا، کیونکہ شکنجے کی گرفت مضبوط ہو رہی تھی۔ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ میں خیمے میں نہیں جنگل میں لیٹا ہوں اور کسی جنگلی جانور نے میرا بازو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور اگر میں نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد نہ کیا تو تھوڑے عرصے ہی میں اس جنگل میں میری ہڈیاں چمکتی ہوئی نظر آئیں گی۔ درد بڑھ رہا تھا۔ شاید یہ بازو ٹوٹ جائے گا، اک کربناک وحشت سے میں تڑپا اور اک آخری کوشش سے میں نے اپنا ہات شمع کی گرفت سے چھڑا لیا لیکن چھڑاتے وقت میرا بھرپور ہاتھ شمع کے چہرے پہ جا پڑا، تڑاخ کی آواز آئی، اس کے لبوں سے اک دبی سی چیخ نکلی اور پھر وُہ خاموش ہو گئی یکایک خداداد ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا، شمع نے بھی جھوٹ موٹ جاگنے کا بہانہ کیا

"کیا ہے راہی؟" وہ بولی

"کچھ نہیں . . ." میں نے کہا

"شائد میں نے اک چیخ سُنی تھی" خداداد بولا

"شائد بے چارا راہی ڈر گیا تھا۔ کیا بہت بُرا خواب تھا اجنبی؟" شمع نے کہا

میرا خون کھول رہا تھا۔ لیکن میں چپ ہو رہا۔

"کیا ہے؟" یکا یک مرجانہ نے آنکھیں کھول کر حیرت سے پوچھا

"کچھ نہیں بے چارا پردیسی ڈر گیا تھا۔ بعض سپنے بڑے بھیانک ہوتے ہیں" شمع نے بڑی متانت سے کہا۔

"سو جاؤ!" خداداد نے کروٹ بدل کر کہا اور سو گیا۔

دیر تک خاموشی رہی۔ پھر شمع آہستہ سے اپنی جگہ سے اُٹھی اور خیمے کا پردہ اُٹھا کر باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اپنی بندوق اُٹھائی اور خیمے کے باہر آگیا۔ چاند وادی کے بیچ میں چمک رہا تھا اور شمع ندی کے کنارے بیٹھی مُنہ دھو رہی تھی۔ میں اُس کے قریب گیا اور اُس سے پوچھا "آدھی رات کے وقت مُنہ دھونے سے کیا ہوگا؟" اُس نے کروٹ موڑ کر میری طرف دیکھا اور میں نے دیکھا کہ

اس کے دانتوں سے خون جاری ہے اور لبوں کے کنارے زخمی ہیں، شائد یہیں میرا ہات پڑا ہوگا۔ میں شمع کے قریب زمین پر بیٹھ گیا اور راوک میں پانی بھر بھر کر اس کے لبوں کے قریب لے جانے لگا۔ تھوڑی دیر میں خون بہنا بند ہو گیا اور زخمی کناروں پر سُرخی کی دو چھوٹی چھوٹی لکیریں رہ گئیں۔ یاقوت کی رگیں جنہیں چومنے کے لئے میرے ہونٹ بیقرار ہو کر پھڑکنے لگے، لیکن میں نے اپنے دانتوں تلے دبا لیا اور حیران ہو کر دیودار کی اس بلبل کو تلاش کرنے لگا، جو اب وہاں نہ تھی، نگاہیں ابھی تک اس بلبل کو تلاش کر رہی تھیں جو بندوق کی ٹھائیں سے مر گئی تھی لیکن اب وہ شور نہ تھا، وہ ٹھائیں نہ تھی۔ راول کی کرخت آواز نہ تھی، دف کا نغمہ نہ تھا، شمع کا رقص نہ تھا اب شمع خاموش میرے سامنے کھڑی تھی اور اس کی آنکھوں کی پُراسرار گہرائیوں میں چاند چمک رہا تھا اور وادی کی نغمگی ختم ہو گئی تھی اور اس کی خاموشی لوٹ آئی تھی۔ اور ہم دونوں اس خاموشی کے بیچ میں کھڑے تھے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے، کیا دیکھ رہے تھے؟ کیا پہچان رہے تھے؟ کیا ٹٹول رہے تھے جیسے دو روحیں آگے بڑھ رہی ہوں اور اپنی نازک غیر مرئی انگلیوں سے ان آنکھوں ان پلکوں، ان رخساروں، اس ٹھوڑی کو پہچان رہی ہوں، میں جانتی ہوں، میں جانتی ہوں تجھے، ہم ایک ہی حرکت کی تال ہیں، ایک ہی لے کی گونج ہیں، ایک ہی سچائی

کی تصویر ہیں۔ آج لاکھوں برس کے بعد ہم ملے ہیں۔ دو ذرّے، دو روحیں، دو شرارے جو اس عظیم ہیولے کے بطن سے نکل بھاگے ہیں جو تمام کائناتوں کا منبع ہے اور آج تک اپنی چھوٹی سی پہنائی کے گرد گردش کرتے رہے ہیں اور اب یکایک اس طرح چلتے چلتے، گھومتے گھومتے، گردش کرتے کرتے ایک دوسرے کے سامنے آگئے ہیں، دو آوارہ ستارے، ایک لمحے کے لئے، صرف ایک لمحے کیلئے جو ابدی ہے، ازلی ہے، جاوداں ہے! . . . ایک دوسرے کے سامنے . . . . صرف ایک لمحے کے لئے جو مجھ میں، تجھ میں، اپنے آپ میں بالکل مکمل تھا دوسرے لمحے میں وہ پھر میرے لئے اجنبی تھی۔ اُس نے خیمے کی طرف قدم بڑھائے اور لمحہ ختم ہوگیا، شرارہ بجھ گیا، خاموشی بھاگ گئی اور رات کا شور لوٹ آیا۔ اب دیوداروں میں ہوا کراہ رہی تھی، جنگل میں گیدڑ بول رہے تھے۔ ندی قہقہے لگا رہی تھی، چاند ہنستا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ فضا میں شور و غل مچا ہوا تھا۔ حتے کہ شمع کے قدموں کی آہٹ اور رخانہ بدوشوں کی سانس اور خیمے کے پردوں کی سرسراہٹ بھی سنائی دیتی تھی۔ اس لمحے سے پہلے ہر شے خاموش تھی اور اب دوسرے لمحے میں ہر شے بول رہی تھی، چیخ رہی تھی اور دماغ میں برمے کی طرح گھستی چلی جا رہی تھی۔ بس یہی ہوتا ہے، کبھی ایک لمحہ دوسرے

لمحے کی طرح نہیں ہوتا، کبھی نہیں ہوتا، اب زندگی کی ترتیب، تواتر، توازن اس طرح ہے، دوسرے لمحے میں اب یوں ہے، اس طرح کیوں نہیں ہے؟ اس طرح کیوں نہیں؟

شمع خیمے کا پردہ اُٹھا کر اندر چلی گئی۔ میرے قدم خیمے کے باہر رُک گئے ہیں وہیں ظالم کے پاس بیٹھ گیا۔ خیمے کے باہر ایک پتھر پر، ظالم اپنے گرم گرم زبان سے میرے ہات کی پُشت چاٹنے لگا اور میں اسے تھپکنے لگا اور اُس کے کھردرے بالوں میں اپنی اُنگلیاں ڈال کر اس کی جلد کو سہلانے لگا، شائد میں اس کی جلد کو نہیں اپنی جلد کو سہلا رہا تھا، اپنے آپ کو تھپک رہا تھا، کیونکہ مجھے بہت جلد نیند آ گئی اور میں وہیں اسی پتھر پر تاروں کی خُنک چھاؤں میں سو گیا اور جب جاگا تو تارے گم ہو چکے تھے اور سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ اور شمع سامنے ندی میں سے نکل کر میرے خچر پر لکڑیوں کا گٹھا لادے چلی آ رہی ہے۔ وہ میرے قریب آ کر رُک گئی۔ اُس نے لکڑیوں کا گٹھا خچر سے اُتار کر خیمے کے سامنے ڈال دیا اور مڑ کر اندر جانے کو تھی کہ میں نے اسے روک کر کہا

"لاؤ، میرا بٹوا مجھے دیدو، میں جا رہا ہوں"۔

یہ کہہ کر میں نے خچر کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔

"کیسا بٹوا؟" شمع نے متین انداز میں مجھ سے دریافت کیا

"وہی جو میں نے تمہیں رات کو دیا تھا۔"

"رات کو دیا تھا؟ مجھے؟ کیا کہہ رہے ہو؟"

"یہ مذاق کا وقت نہیں ہے،" میں نے جھلا کر کہا۔ "بٹوا نکالو۔ مجھے جلدی جانا ہے۔"

خداداد اور راول سامنے سے ادھر آرہے تھے۔

خداداد بولا۔ "کس بٹوے کی بات کر رہے ہو؟"

اس کا لہجہ استہزائیہ تھا

میں نے چیخ کر کہا۔ "میں نے اسے دیا تھا۔ رات کو۔ مرجانہ کے سامنے کہاں ہے مرجانہ؟ بلاؤ اُسے . . . ."

شمع بولی۔ "مرجانہ یہاں نہیں ہے۔ وُہ جنگل سے ابھی تک نہیں لوٹی لکڑیاں چُننے گئی ہے۔"

"وُہ بٹوا تم نے اسے کیوں دیا تھا۔" راول نے مسکرا کر پوچھا

"میں نے سوچا اس کے پاس محفوظ رہے گا۔"

"اچھا تو تم ہمیں ٹھگ سمجھتے ہو۔" راول چنگھاڑا۔ "رات بھر ہم نے تمہیں

پناہ دی، تمہیں ڈاکوؤں کے گاؤں میں قتل ہونے سے بچایا اور اب تم ہمیں چور کہتے ہو۔"

شمع نے راول کے ہاتھ سے بندوق چھین لی اور مجھ سے کہنے لگی "ابھی چلے جاؤ۔ اسی دم۔ . . . ورنہ . . . ."

میں نے شمع کی طرف دیکھا۔ راول کی طرف دیکھا۔ خداداد کی طرف دیکھا اور پھر خچر کو ندی میں ڈال دیا۔

آج راستہ اکیلا تھا، میں اکیلا تھا، میرے اردگرد ہر شے اکیلی تھی بٹوے کے کھو جانے کا بھی ملال نہ تھا۔ پھر کس شے کے کھو جانے کا ملال تھا دل رنجور تھا۔ دماغ پر ایک عجیب سی وحشت۔ اک نامعلوم سی اُلجھن چھائی ہوئی تھی، اس کا تجزیہ نہ ہو سکتا تھا۔ شمع پر، خانہ بدوشوں پر، اپنے آپ پر، سست رفتار خچر پر، کسی پر غصہ نہ تھا۔ بس اک ہلکی سی، نازک سی، کبھی ختم نہ ہونے والی اُداسی چاروں طرف چھائی ہوئی تھی اور خچر آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ ایک خرگوش سامنے سے راستہ کاٹ کر تیزی سے گزر گیا، ایک درخت کے پیچھے مجھے لومڑی کی سمور دار دُم بھی نظر آئی، لیکن میرا ہاتھ بندوق پر نہ گیا، ایک جگہ وہ سوکھا ہوا آ

درخت کھڑا تھا۔ جہاں سے پگڈنڈی اپنا رُخ بدلتی ہے۔ لیکن آج مجھے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ پگڈنڈی نے اپنا رُخ بدلا ہے۔ یہی محسوس ہو رہا تھا کہ یہ پگڈنڈی اسی طرح ایک ہی رُخ پر، ایک ہی نہج پر چلی جا رہی ہے۔ یہ راستہ بہت لمبا ہے، یہ سفر بے منزل ہے..... میں اونگھنے لگا.....

یکایک میں جاگ اُٹھا، کسی نے ٹھوکا دے کر مجھے جگایا تھا۔ "راہی"

"اترو" شمع بولی

میں خچر سے اُتر پڑا اور ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ میں نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ تم کیوں آئی ہو۔ کدھر جا رہی ہو۔ بس ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے کاڑ کے اک بڑے جھنڈ کے قریب ہم دونوں از خود رُک گئے۔ اس جھنڈ پر انگور کی جنگلی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں اور سبز داب پر بنفشے کے پھول مسرت آگیں بوسوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ یہاں سے دونوں وادیوں کا دلفریب نظارہ دکھائی دیتا تھا۔ ایک طرف رنگپور کی وادی تھی۔ دوسری طرف چمن کوٹ کی۔ بیچ میں دو وادیاں مل جاتی تھیں اور اس نقش لاجوردی میں ندی کا پانی نقرئی لہر کی طرح چمک رہا تھا

میں نے شمع کی طرف دیکھا

اُس نے قمیص کے اندر ہات ڈالا اور بٹوا نکال کر میرے ہات میں دیدیا
مَیں حیرت سے اُس کی طرف تکنے لگا اور میری نگاہیں اس کے زخمی
لبوں پر جم گئیں۔ وُہ یاقوتی رگیں۔ نازک مہین کنارے۔ بنفشے کی پنیوں کے
خم... مَیں اُس کے چہرے پر جُھک گیا۔

وُہ منہ موڑ کر آہستہ سے کہنے لگی: "مجھ سے شادی کرو گے؟"

"شادی؟" مَیں نے پوچھا

وُہ چُپ رہی۔ میری طرف دیکھتی رہی۔

"شادی؟" مَیں نے آہستہ سے کہا... "تم —" میں سوچنے لگا
— "تم ہمارے گاؤں چلو — تو پھر... مَیں تم سے شادی کر لوں گا"

"تمہارے گاؤں؟"

"ہاں ہاں وہ رہا سامنے رنگپور...!"

"لیکن میں گاؤں جا کر کیا کروں گی" وُہ حیران ہو کر بولی۔

"میں نمبردار کا بیٹا ہوں" مَیں نے فخریہ انداز میں کہا "وہاں میرا گھر ہے
زمین ہے، کھیت ہیں، مویشی ہیں۔ نوکر، چاکر، عزت، دولت اور — اور
..." میں رُک گیا۔

وہ بولی: "میں چاہتی تھی تم میرے ساتھ چلو۔"

"تمہارے ساتھ؟ کہاں؟ ——"

"دھرن کوٹ میں میرا قبیلہ ہے، میری ماں کا قبیلہ جسے میرے باپ نے چھوڑ دیا تھا۔ دھرن کوٹ میں آج کل بھی برف ہو گی۔ چاروں طرف سفید سفید برف . . . . "

شمع کی وحشی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اُس نے سختی سے میرا ہات پکڑ لیا اور کہنے لگی۔

"ہم دونوں وہاں ایک خیمے میں رہیں گے، تمہاری انگریزی بندوق بہت اچھا شکار کرے گی۔ تم —— تم ہمارے قبیلے کے سردار ہو گے۔ رات کو میں دف پر ناچوں گی، تم نے میرا ناچ دیکھا ہے نا . . . . " اُس نے اپنا بازو جھٹک دیا۔

میں نے اس قبیلے کو دیکھا۔ چاروں طرف پڑی ہوئی برف کو دیکھا۔ دف کو دیکھا۔ میلے کچیلے خیمے کو دیکھا۔ اس بستر کو دیکھا۔ جس سے پُرانے دھیال کی بُو آتی تھی اور میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا . . . . "لیکن، شمع! میرے کھیت، میرا گھر، میری دولت، وہ سارا سامان، وہ گاڑیاں، وہ برادری . . . .

ان کے بغیر میں کیسے زندہ رہ سکوں گا؟"

شمع نے نہایت سادگی سے کہا: "زندہ رہنے کے لئے یہ کھلی زمین اور یہ کھلا آسمان کافی نہیں؟ ... ایک خیمہ ہو، ایک بندوق اور ایک ہم نفس کی آغوش ... کیا یہ کافی نہیں؟ ...."

"تم سمجھتی نہیں ہو .... تم ـــــ میں تمہیں کیسے بتاؤں. تم خانہ بدوش ہو ...."

یکایک اُس کی آنکھوں کی روشنی مرگئی، وہ چمک، وہ تابانی جاتی رہی اُس نے آہستہ سے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ پھر رُک رُک کر کہنے لگی:-

"میں نے تمہیں غلط سمجھا تھا۔ تم وہ آدمی نہیں ہو...."

"کونسا آدمی؟"

"... جانے دو، تم نہیں سمجھو گے۔"

"مجھے بہت افسوس ہے" .... میں کہنے لگا.

لیکن شمع نے مجھے بیچ ہی میں ٹوک دیا اور بولی: "اب میں دھرن کوٹ جانا چاہتی ہوں .... اب میں اپنے بھائی کے پاس نہ جاؤں گی، اب ـــــ راول میرا مُنہ نہ دیکھے گا، آج سے مرجانہ میرے لئے مرگئی....

کیا تُو یہ خچر مجھے دے دیگا اجنبی۔ میرا راستہ بہت لمبا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

راستہ بہت دُور ہے اور سفر بے منزل ہے، میں سوچنے لگا، لاکھوں برس کے بعد دو شرارے ایک لمحے کے لئے، ایک دوسرے کے سامنے آتے ہیں اور دوسرے لمحے میں الگ ہو کر گردش کرنے لگتے ہیں، ایک لمحہ . . . . دوسرا لمحہ . . . . دونوں میں سات سمندروں کا وقفہ اور سات کائناتوں کا بُعد ہے، اس لمحہ میں انسان کا جنگل سے ناطہ ہے، دوسرے لمحے میں یہ ناطہ ٹوٹ چکا ہے، ہمیشہ کے لئے . . . . .

"شمع!" میں نے آہستہ سے کہا "کبھی ایک لمحہ دوسرے کی طرح نہیں ہوتا!"

"کیا کہتے ہو تم . . . . ؟" اُس کی پتلیاں حیران تھیں

". . . . جانے دو۔ تم نہیں سمجھوگی . . . ."

مَیں نے خچر کی لگام اُس کے ہاتھ میں تھمادی، اُس نے اپنے زخمی لبوں کے کناروں پر اپنی پتلی سُرخ زبان پھیر کر ایک لمحے کے لئے میری طرف دیکھا اور پھر اُچک کر خچر پر سوار ہو گئی اور پھر میری طرف دیکھے بغیر کہنے لگی "اچھا خدا حافظ!" اور پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ خچر کو دوڑاتی ہوئی

دھرن کوٹ کے راستے پر چلی گئی۔

میں دیر تک اس دوراہے پر کھڑا رہا۔ وُہ دوراہا جو شمع کے قبیلے کی طرف جاتا تھا۔ وُہ دوراہا جو میرے گاؤں کی طرف جاتا تھا۔ میں نے دو قدم دھرن کوٹ کے راستے کی طرف بڑھائے۔ پھر پلٹ کر آہستہ آہستہ اپنے گاؤں کی طرف چلنے لگا۔

کتبہ:- اقبال عباسی لاہور

کرشن چندر

اُردو کا محبوب، منفرد، مجتہد اور مسلمہ فن کار

روشنائی کی بجائے اپنے خون سے لکھنے کا عادی ہے۔ وہ طلائی جھنکاروں کی رودادیں بیان نہیں کرتا بلکہ ان جھنکاروں میں دبی ہوئی بھوکوں کے تجزیئے کرتا ہے۔ دھرتی پر جہاں کہیں ظلم کا پرچم بلند ہوتا ہے کرشن چندر اس کے خلاف مظلوم انسانیت کے احتجاج کی ترجمانی کرتا ہے۔ جہاں کہیں آزادی اور انصاف کی جنگ لڑی جاتی ہے۔ کرشن چندر کا قلم اس کی حمایت کرتا ہے۔

کرشن چندر

کسی ایک قوم، ایک فرقے یا ایک نسل کا ادیب نہیں
وہ ساری انسانیت کا ادیب ہے